

شماره نمبر ۱۰

# ادبیات سنہ



اکیڈمی ادبیات پاکستان



# ادبیات سنت

(شمارو نمبر ۱ - ۲۰۲۱ ع)

نگران  
ڈاکٹر یوسف خشک

ایڈیٹر  
قادر بخش سومرو



ادبیات اکادمی سندھ  
لیاقت میموریل لائبریری بلڈنگ اسٹیڈیم روڈ کراچی



## حق ۽ واسطو اداري وٽ محفوظ آهن

ڄڻي، جو سال فيبروري 2021ع

### ضروري گذارشون

رسالي براڻ ڇپيل لکڻيون شامل  
ڪيون وينديون.  
رسالي ۾ شايع ٿيل سڀني لکڻين  
کي ليکڪن جي راءِ خيال تحقيق  
سمجهيو وڃي. جنهن سان رسالي  
جي ايڊيٽوريل بورڊ جو سهمت  
هجن ضروري ناهي  
سڀني لکڻيون سنڌي ورڊ فارميٽ  
۾ هيٺ ڏنل اي ميل ايڊريس تي  
امانيون وڃن.

[palsindhkar@gmail.com](mailto:palsindhkar@gmail.com)

لياقت ميموريل لائبريري بلڊنگ  
اسٽيڊيم روڊ ڪراچي

### ايڊيٽوريل بورڊ

ڊاڪٽر شير مھراڻي  
ڊاڪٽر عابد مظهر  
نصير سومرو  
اي بي لاشاري  
ضياءِ ابڙو  
وحيد محسن  
سيما عباسي  
عبدالستار رستمائي  
ياسمين چانڊيو  
ڊاڪٽر آمن سومرو

قيمت في شمارو 150 روپيا (ملڪ اندر) 40 آمريڪي ڊالر (ڏيساور)،  
رسالو ملڪ اندر رجسٽري پوسٽ وسيلي ۽ ڏيساور هوائي پوسٽ وسيلي موڪلي  
سگهجي ٿو.

021-99231154

قادر بخش سومرو

ناشر

021-99231154

اقبال احمد

مرڪيوليشن انچارج

ڪوڙل ڏهراج

پيڇ ميڪنگ ۽ ڊزائين

### اڪادمي ادبيات پاڪستان

لياقت ميموريل لائبريري بلڊنگ اسٽيڊيم روڊ ڪراچي

رابطو نمبر 021-99231154

ڇپيندڙ مرڪ پبليڪيشنز ۽ پرنٽرز ڪراچي

106 صابر منزل نزد گل پلازا ايم اي جناح روڊ ڪراچي

[mark-publication@gmail.com](mailto:mark-publication@gmail.com)

03005182494

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ  
سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنف کتاب کے لیے نیک خواہشات  
کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیر نظر کتاب فیس بک گروپ ”کتبِ حنائہ“ میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔  
گروپ کالک ملاحظہ کیجیے :

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>



میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068





## فهرست

|    |         |                |
|----|---------|----------------|
| 07 | پیغام   | شفقت محمود     |
| 09 | حرف اول | ڈاکٹر یوسف خشک |

### تحقیق، تنقید، نقطہ نظر

|    |  |                    |
|----|--|--------------------|
| 13 | شیخ ایاز ۽ سنڌي ٻوليءَ کي درپيش چئلينج       | ڊاڪٽر فهميده حسين  |
| 25 | پلاٽ کان بغير دنيا جي ڪهاڻي                  | ڊاڪٽر غفور ميمڻ    |
| 31 | ملائيشيا جي موسر....                         | الطاف شيخ          |
| 38 | سنڌو سڀيتا ۽ عمان (ماڳان) وچ ۾ واپاري لاڳاپا | رڪ سنڌي            |
| 44 | سنڌي ڪهاڻيءَ جو جديد حوالو بادل جمالي        | ڊاڪٽر شير مھراڻي   |
| 58 | ڊاڪٽر ٻولي ۽ ان جو لوڪ ادب: مختصر جائزو      | ڊاڪٽر قلندر سنڀر   |
| 67 | شاعري جو رومانس                              | نصير سومرو         |
| 79 | تن ميمڻ جو پختو شاعر - قربان گل              | حزب الله آءِ سومرو |
| 81 | ننڍي کنڊ جو يگانو شاعر سرڪش سنڌي             | عزيز قاسمي         |
| 86 | قمر شهباز جي شاعريءَ ۾ وجوديت جو فڪر         | امر هاني سنڌو      |
| 92 | پير بخش خان عرف پيرل فقير جوڻيجو             | اورنگزيب عاجز      |

### ڪهاڻيون

#### فلئيشن فڪشن

|     |  |                 |
|-----|--|-----------------|
| 97  | زهرا                                   | رزاق سھتو       |
| 110 | اڙي شهر جانان                          | راز شر          |
| 114 | فقير جو پڙ                             | ضراب حيدر       |
| 129 | اُستاد به واقعي اُستاد آهن!            | جاويد شيخ       |
| 133 | دلير ملي ويو...                        | عباس سارنگ      |
| 137 | اجازت                                  | وفا صالح راجپر  |
| 141 | سوني                                   | سونيا شاهي      |
| 144 | ڊائي سو                                | شفيع بڪڪ        |
| 147 | ”نه نه اهڙي ڳالهه ناهي!“، ”فيڪ آءِ ڊي“ | ڊاڪٽر عابد مظهر |
| 148 | ڏکيو فيصلو                             | مرلي ڌر         |
| 148 | ”ڇڳل ڇڳل“                              | عباس سارنگ      |
| 149 | عڪس                                    | عبدالواحد سومرو |

## شاعري

### غزل

|     |                 |
|-----|-----------------|
| 153 | ج ع منگهاڻي     |
| 154 | اياز گل         |
| 155 | تاج جويو        |
| 156 | اسحاق سميجو     |
| 157 | نور خان نواب    |
| 158 | سميع بلوچ       |
| 159 | محمد علي پٺاڻ   |
| 160 | اقبال رند       |
| 161 | شوڪت اڄڻ        |
| 162 | ضمير ڦل         |
| 163 | علي آڪاش        |
| 164 | ڊاڪٽر مبارڪ علي |
| 165 | مير صوبدار سعيد |
| 166 | سجاد ميراڻي     |
| 167 | سعيد سومرو      |
| 168 | امداد سولنگي    |
| 169 | امجد دراني      |
| 170 | قربان چنا       |
| 171 | مجاز سولنگي     |
| 172 | سيما عباسي      |
| 173 | خالدہ نسرین     |
| 174 | مرتضيٰ لغاري    |
| 175 | ياسمين چانڊيو   |
| 176 | مزمل سائر       |
| 177 | علي زاهد        |
| 178 | زاهد ڄامڙو      |
| 179 | حسن پنهيار      |
| 180 | سڪندر شيخ       |
| 181 | صدام حسين باغي  |
| 182 | اطهر منگي       |
| 183 | سعيد سنڌي       |



|     |                                     |
|-----|-------------------------------------|
| 184 | آغانياز مگسي                        |
| 185 | معشوق محسن ابڙو                     |
| 186 | گلشن سنڌو                           |
| 187 | اظهر پانيڻ                          |
| 188 | احساس ميرل                          |
| 189 | بلال تبسم                           |
| 190 | حيدر علي نونائي                     |
| 191 | گلاب چانڊيو                         |
| 192 | ڊاڪٽر فاطمه حسن ترجمو شاھ زمان پنگر |

### نظم، وايون، ڪافيون ۽ ٻيون صنفون

|     |                   |
|-----|-------------------|
| 195 | امداد حسيني       |
| 196 | ڊاڪٽر آڪاش انصاري |
| 197 | مدد علي سنڌي      |
| 198 | عطيه دائود        |
| 199 | ع غ تبسم          |
| 202 | ادل سومرو         |
| 203 | سرمد چانڊيو       |
| 205 | روبينه ابڙو       |
| 207 | انيس ميمڻ         |
| 208 | ڊاڪٽر جمال نقوي   |
| 209 | مشتاق قل          |
| 210 | ڊاڪٽر رخسان پريت  |
| 211 | ضياء ابڙو         |
| 212 | هدايت بلوچ        |
| 213 | صدا لاشاري        |
| 214 | زهيد پيرزادو      |
| 216 | امر پيرزادو       |
| 218 | پشپا ولف          |
| 219 | مصطفي انڙ         |
| 220 | قادر بخش سومرو    |
| 221 | سنڌو ستار پيرزادو |
| 223 | عريشا بخاري       |

## پیغام

وفاقی وزیر جناب شفقت محمود کا پاکستان کے تمام صوبوں سے ”ادبیات“ کے شماروں کے اجرا کے موقع پر خصوصی پیغام

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر انتظام پہلی بار تمام صوبوں سے ’ادبیات‘ کے شماروں کا اجرا ایک نہایت خوش آئند منصوبہ ہے۔ خوش گوار بات یہ ہے کہ ان پرچوں میں پاکستانی زبانوں کا ادب ان ہی زبانوں کے رسم خط میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ایسا منفرد اشاعتی منصوبہ جاری کرنے پر اکادمی داد کی مستحق ہے۔

یہ منصوبہ لسانی و تہذیبی ہم آہنگی کو تقویت دینے اور زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی طرف ایک نہایت موثر قدم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ملکی ثقافتوں اور زبانوں میں موجود حکمت و دانش کی روایت سے براہ راست استفادے کی ایک کامیاب کوشش بھی ہے جو رواداری، محبت اور یگانگت کے پیغام کی حامل ہے۔ پاکستانی زبانوں میں بکھرے ہوئے ان حکمت و دانش کے موتیوں کو ایک لڑی میں پر دینے کی ضرورت ہے جسے اکادمی ادبیات پاکستان کا زیر نظر اشاعتی منصوبہ کما حقہ پورا کرتا ہے۔ یہ اشاعتی منصوبہ پاکستان بھر میں لکھنے والوں کو قریب لانے کے عمل کو بھی تقویت دے گا اور ان کے لیے ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کے مزید مواقع پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔ ہر پنج گواہ ہے کہ کسی ملک کو ترقی کی دولت تب تک نصیب نہیں ہوئی جب تک کہ اس نے اپنے اہل قلم طبقے کی فلاح اور فروغ اور ملکی ثقافتوں اور زبانوں کے لیے ترقی کی راہیں نہیں کھولیں۔

پاکستان کے تمام صوبوں سے علیحدہ علیحدہ جریدوں میں مختلف پاکستانی زبانوں کے ادب کی



منتخب تحریروں کی اشاعت سے ملکی ادبی منظر نامے کی جامع تصویر سامنے آتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی اور ادبی سطح پر ہمارا ملک کیسا خوش رنگ اور ہمہ جہت ہے۔ بہت ضروری ہے کہ ان رنگوں اور خوش بوؤں کو ہر سو پھیلا یا جائے، تاکہ معاشرتی محسن کا خاتمہ ہو، مکالمے، آپسی افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کی فضا کو تقویت ملے، بنیادی انسانی اقدار کو فروغ حاصل ہو اور ادبی سطح پر مزید ثقافتی اپنائیت پیدا ہو۔

میں خلوص دل سے چیئر مین اکادمی ادبیات پاکستان ڈاکٹر یوسف خشک کی ملکی ثقافتی اور ادبی ترقی کے لیے کاوشوں کو سراہتا ہوں اور ان کے جاری رہنے کی امید کرتا ہوں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

شفقت محمود

وفاقی وزیر برائے تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت  
قومی وراثہ ثقافت ڈویژن پاکستان

## حرفِ اول

سندھ کی دھرتی کئی ہزار برسوں سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ جب دنیا کے بیشتر حصوں میں انسان خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اس وقت بھی یہاں ایک عظیم تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ ادب ظاہر ہے تہذیب کے اظہار کا ایک اہم بلکہ میں کہوں گا کہ سب سے اہم ذریعہ ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ادب کی روایت قبل از تاریخ بھی موجود تھی۔ زندہ زبانوں کی طرح سندھی زبان بھی ہر دور میں یہاں بولی جانے والی زبانوں سے نہ استفادہ حاصل کرتی آئی ہے، مگر آج بھی اپنی دھرتی سے باقاعدہ جڑی ہوئی ہے جس کا اظہار جدید سندھی ادب میں بخوبی ہو رہا ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام سہ ماہی ادبیات اور سہ ماہی ادبیات اطفال اردو میں جب کہ ششماہی پاکستانی لٹریچر انگریزی میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ان تمام جریدوں میں سندھی اور دیگر زبانوں کے ادب سے تراجم باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں لیکن اس بات کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی کہ اکادمی کوئی ایسا جریدہ بھی شائع کرے جس میں پاکستانی زبانوں کا ادب ان کے اپنے رسم خط اور اپنی زبان میں شائع ہو۔ یہ جریدہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

زیر نظر جریدے ”ادبیات سندھ“ میں صوبہ سندھ میں لکھے جانے والے ادب کو ان ہی زبانوں کے رسم خط میں شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ملک کے تمام صوبوں میں سے اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت ایسے شمارے شائع کیے جا رہے ہیں۔ اکادمی کی یہ کوشش تمام پاکستانی زبانوں کے ادب کی زرخیزی اور ان کے ادباء شعراء کو مزید قریب لانے کی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ ایک ہی شمارے میں مختلف پاکستانی زبانوں کے متن کی موجودگی قومی ہم آہنگی کی ایک مثال ہے۔



اس شمارے میں مختلف زبانوں کے تازہ ترین ادب کا انتخاب؛ جو ہمیں بروقت مل سکا ہے، پیش کیا جا رہا ہے۔ ہم ان تمام تخلیق کاروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے صوبہ سندھ سے شائع ہونے والے اکادمی کے اس اولین شمارے کے لئے ہمیں اپنی تخلیقات فراہم کیں۔ اکادمی کے بورڈ آف گورنرز، ”ادبیات سندھ“ کی مجلس مشاورت اور مجلس ادارت کا بھی بے حد شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے تعاون، رہنمائی اور انتھک محنت کے سبب یہ سب کچھ ممکن ہو سکا۔

میں خصوصی طور پر صوبہ سندھ کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ ڈائریکٹر جناب قادر بخش سومرو صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ جنہوں نے ادبیات سندھ کی ذمہ داری بطور مدیر منتظم خوشی سے قبول کی اور احسن طریقے سے نبھائی۔

یہ ابتدائی کوشش ہے اور امید ہے کہ قارئین کرام ہماری اس کوشش میں بہتری لانے کے لئے اپنی تجاویز سے نوازیں گے۔

ڈاکٹر یوسف خشک  
میریٹورس پروفیسر  
چیئر مین اکادمی ادبیات پاکستان

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے  
ایک اور کتاب۔  
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں  
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>

میر ظہیر عباس دوستمانی  
0307-2128068

@Stranger

تحقیق،

تنقید،

نقطہ نظر



## شيخ اياز ۽ سنڌي ٻوليءَ کي درپيش چئلينج

سنڌي ٻوليءَ ۽ شيخ اياز جي تعلق کي سمجهڻ لاءِ سڀ کان پهرين ته اهو ضروري آهي ته ڏسجي ته شيخ اياز جو سنڌي ٻوليءَ ۾ لکڻ جو فيصلو شعوري هو يا غير شعوري! شيخ اياز پنهنجي بنهه ابتدائي دور ۾ اردو شاعري ٻي ڪئي، پر پوءِ هڪ مرحلي تي سنڌيءَ ۾ لکڻ کي ترجيع ڏنائين، ان بابت 1955ع ۾ ٽماهي مهراڻ رسالي ۾ سندس هڪ خط محمد ابراهيم جويي جي نالي لکيل ڇپيو جنهن ۾ هن لکيو هو ته:

”مون سمجهيو ته اردو سنڌيءَ کان وڌيڪ وسعت رکي ٿي ۽ منهنجي خيالات جي بيحدگي ۽ گهرائي ان ۾ چڱيءَ طرح سمائجي سگهندي پر گذشتہ وٽڪيشن ۾ مان سٺو ڪن بيت لکيا آهن سنڌيءَ ۾، جن مان مونکي پڪو يقين ٿي چڪو آهي ته جيڪي مان پنهنجي مادري زبان ۾ لکي ٿو سگهان سو ڪڏهن به ٻي زبان ۾ نه لکي سگهندس. ڪيترو پلڻ پٽڪڻ کان پوءِ مان سنڌيءَ ۾ بهترين ذريعہ اظهار گولي ڪڍيو آهي.“

اياز جي هن بيان مان سندس به اعتراف واضع ٿين ٿا. پهرين اهو ته سنڌي زبان ۾ سندس خيالات جي پيچيدگي ۽ گهرائي، کي سمائجي سگهڻ جي سگهه موجود ڏسي فيصلو ڪيائين ته آئيندي هو سنڌيءَ ۾ لکندو، ۽ ٻيو اهو ته ڪو به شاعر جيڪي پنهنجي مادري ٻوليءَ ۾ لکي سگهي ٿو سو ڪنهن به ٻي ٻوليءَ ۾ لکي ڪونه سگهندو ان ڪري هن سمجهيو ته هن سنڌيءَ ۾ پهرين اظهار جو ذريعو گولي ڪڍيو هو. يعني ته پنهنجي ماءُ ٻولي ٿي ڪنهن اديب ۽ شاعر جي تخليق جي اظهار لاءِ بهترين وسيلو ٿئي ٿي.

اياز جي ان شعوري فيصلي کيس مايوس ڪونه ڪيو ۽ هو هڪ ڊگهي عرصي تائين لکي پنجاهه کان مٿي ڪتاب تخليق ڪري ڏئي ويو. هن جي شاعريءَ بابت سائين محمد ابراهيم جويي کي چوڻو پيو ته:

”اياز جي شاعري سنڌي ٻوليءَ جو هڪ ڪرشمو آهي، ٻولين جا اهڙا ڪرشما جڳي کان پوءِ ظاهر ٿيندا آهن ۽ جڏهن ٿيندا آهن تڏهن اهي ٻولين

سان گڏ پنهنجي پنهنجي دطو طر جي ڪايا پلٽ جا داعي ۽ اٽل سبب بڻبا آهن. (مون ذات انوڪي آندي آ- ص 19)

جڏهن ته ٻولي ڪنهن به قوم جي سڃاڻپ هوندي آهي، سو اسان جي سڃاڻپ جو حوالو به سنڌي ٻولي آهي، ان سان محبت ۽ انسيت ئي اها ڪسوٽي آهي، جنهن تي اسين سنڌي ڪنهن شاعر کي پرکيندا آهيون. اها حقيقت آهي ته ڪنهن به شاعر جي ذات اوستائين سهاڳڻ نٿي سڏي سگهجي جستائين ٻوليءَ جي محبت سان لائون نٿي لهي، بنا ٻوليءَ سان سک ۽ سنهه جي پلا ڪو شاعر ڪيئن ٿو شاعري ڪري سگهي! اهڙي شاعري بي چسي، بي رنگ ڪنهن ڏهاڳڻ جهڙي هوندي آهي، جنهن جو رنگ روپ مصنوعي ۽ هٿرادو هوندو آهي. ٻولي ته شاعريءَ جو سهاڳ آهي جنهن جو اها ان کي روپ بخشيندو آهي ۽ اها روپونتي ئي پوندي آهي، ان ڪري ان جي وارثي ڪرڻ ۽ سڀني بر سانڍڻ ضروري هوندو آهي، جنهن جو اظهار شيخ اياز ڪيو ۽ جنهن تي عمل ڪري به ڏيکارين. سنڌ ۽ سنڌي ٻوليءَ سان ته سندس جيءَ جڙيل هو، بلڪل ائين ئي جڏهن اٽليءَ جي شاعر ڊانتي (Dante) پنهنجي شاهڪار شاعري ”خداڻي طربيه“ (Divine Comedy) لکڻ وقت شعوري فيصلو ڪيو هو ته هو اطالوي (اٽليءَ جي ٻوليءَ جي هڪ) ننڍڙي ٻوليءَ، ٽسڪن (Dialect Tuscan) ۾ لکي ۽ ائينهن ان کي اٽليءَ جي معياري ٻوليءَ جو درجو ڏياري ڇڏيو هو، ان کان اڳ اتي جي علمي ادبي ٻولي لاطيني/ لئٽن کي سمجهيو ويندو هو.

شيخ اياز جي شاعريءَ جا قدردان ۽ سندس پرستار جڏهن جوڙ ۾ اچي اها دعويٰ ڪندا آهن ته شاھ لطيف کان پوءِ شيخ اياز سنڌ جو وڏو شاعر آهي ته مٿن اعتراض ڪيو ويندو آهي ته پوءِ وڃ، مان شاھ عنايت، سچل، سامي، بيدل، بيڪس ۽ ٻيا ڪيترائي اهر شاعر ڪيڏانهن ويا؟ اهي به ته سنڌيءَ جا وڏا ناليوارا شاعر ٿي گذريا آهن. منهنجي خيال ۾ ته ڪلاسيڪي سلسلي جا اهي عظيم شاعر شاھ لطيف کان پوءِ جا اهر شاعر آهن، جيڪي سندس راي تي هليا. لطيف ۽ اياز جي انفراديت اها آهي ته لطيف ڪلهوڙن جي دور ۾ فارسي ٻوليءَ جي تسلط ۽ سرڪاري ۽ درباري حيثيت توڙي علم ادب جي ٻوليءَ جي حيثيت ۽ اهميت اجاگر ڪئي ته ٻئي طرف ان جي جهڙوڪر نئين سر تشڪيل ڪئي، ان جو دامن وسيع ڪيو، ان جي لغت ۾ اضافو ڪيو ۽ ڄڻ ته هو تيرهين صديءَ جي يورپ جي ڊانتي وانگر 18 صديءَ جي سنڌ ۾ سنڌي ٻوليءَ کي نئون جنم ڏياريندڙ، ان جي تعمير ڪندڙ معمار ۽ محسن بنجي ويو. بلڪل ائين ئي شيخ اياز جي شاعريءَ

بابت چئي سگهجي ٿو. 20 صديءَ جي سنڌ ورهاڱي کانپوءِ جنهن مخصوص صورتحال کي منهن ڏنو اها ڪنهن کان ڳجهي ڪانهي. ون يونٽ کان پوءِ سنڌي ٻوليءَ کي ڏيهه نيڪالي ڏيڻ ۽ ان جي جاءِ تي ٻاهران آيل هڪ ٻوليءَ کي ٺاڻڻ جي رد عمل طور شيخ اياز جي سنڌيءَ ۾ لکڻ جي شعوري ڪوشش ان کي نئون جيئڻ ڏنو. اردوءَ کي ڇڏي سنڌيءَ ۾ لکڻ سان هن سنڌي ٻوليءَ کي اهو ماڻ ۽ مقام بخشيو جو اها 20 صديءَ جي سنڌ ۾ گهٽ ۽ پوسٽ جو شڪار هوندي به پير پختا ڪري سئي. اها ڇڻ ته هڪ تحريڪ هئي جنهن جو هو سرواڻ هو ۽ ان دور جا ٻيا سمورا شاعر ان روايت تي هلندي پنهنجي ذات سان سنڌي ٻوليءَ جي دامن کي وسيع تر ڪندا رهيا. شيخ اياز نت نون علامتن ذريعي قومي ۽ طبقاتي جدوجهد کي مهين ڏني، 20 صديءَ ۾ اياز سنڌيءَ ۾ نه لکي ها ته اردو اسان جي ٻوليءَ کي ڪائي وڃي ها!

سو شاه لطيف ۽ شيخ اياز جي وچ ۾ اها نسبت آهي.

ڪجهه شاه ڏني، ڪجهه شيخ ڏني

هن سنڌيءَ کي صورت لوڪو.

جهڙيءَ ريت شاه لطيف سنڌي ٻوليءَ کي نئون جنم ڏنو، ان جي تعمر ڪئي، فارسيءَ بدران سنڌيءَ ۾ شاعري ڪرڻ جو رواج وڌو، ان جي تخليقي سگهه ۾ واڌارو ڪيو، ان کي وسعت بخشي، نوان تجربا ڪيا، مختلف گهاڙيا جوڙيا، نت نوان تصور ۽ تصوف جي نئين ساڃاهه پيدا ڪئي، لوڪ ڪهاڻين جي ڪردارن کي ٻيهر نئين زندگي ڏني، محبت، امن، رواداريءَ ۽ برداشت جي قدرن سان گڏوگڏ پنهنجن حقن لاءِ آزاديءَ ۽ عزت نفس لاءِ ڏاڍن سان مهاڏو انگائڻ ۽ انڪار ڪرڻ جو ساهس ڌارڻ جو درس ڏنو ۽ سنڌي ٻوليءَ کي مستقبل جي ادب جي ۽ علم جي ٻولي بڻايو، تيئن، ساڳئي جذبي سان شيخ اياز وري ان کان اڏائي سئو سال پوءِ ادب ۽ ٻوليءَ ۾ آيل جمود کي ٽوڙيو، ڏاڍ خلاف مزاحمت جو رواج وڌو ۽ اردوءَ جي تسلط، تقليد ۽ تسبع کان جان ڇڏائي جيڪو ڪم ون يونٽ دوران سنڌي سياستدان نه ڪري سگهيا: اهي نه سنڌي ٻوليءَ جي استعمال تي پابنديءَ خلاف ڪجهه ڪري سگهيا. نه ان کي ڪا مڃتا ڏياري سگهيا ۽ نه ئي ان جي قدامت، اصليت ۽ عظمت کي مڃرائي سگهيا، اهو ڪم سنڌ جي اديبن ڪري ڏيکاريو. جن سائين محمد ابراهيم جويي جي سرواڻيءَ ۽ رهنمائيءَ ۾ اهو ذموڪيو ۽ شيخ اياز عملي طور اهو ڪري ڏيکاريو. هي سنڌي ٻوليءَ جي هڪ وينجهار وانگي ويهي ان جي اکر اکر، لفظ لفظ کي



موتين واري جلا بخشي، ان ۾ فني تجربا ڪيا، نوان موضوع، جديد ترين نظريا ۽ فڪر فلسفا، نڪور گهاڙيا ڏنا، ٻوليءَ جي لفظن کي نوان مفهوما بخشيا. اها ڪهڙي صنف آهي جنهن ۾ هن شاعري نه ڪئي: ڪلاسيڪي روايت مان بيت، وايون، ڏوهيڙا ۽ گيت آندائين، لوڪ جديد انداز سان ڪنيائين ۽ انهن کي جديد روپ ڏنائين، غزل، نظر، تراويل، سانيت، ٽيڙو، هائيڪو، نثري نظر، قطعا، چوستا، ڏيڍ ستا، منظوم ڊراما، سنگيت ناٽڪ، ڪهڙا ڪهڙا نالا ڪڏهن؟ ايڏو وڏو ڪينواس آهي سندس تخليق جو! ان ۾ فڪر ۽ فن جون خوبيون، هيٽون، شاعراڻيون صنعتون (ضايڪ بدايڪ) تشبيهون استعارا، اشارا، ڪتايو، ڪيتريون گونا گون جهتون آهن! جدت آهي، ندرت آهي، پر انهن ۾ هڪڙي مهڪ نمايان آهي، سا آهي سنڌ جي مٽيءَ جي مهڪ - نچ سنڌي ٻولي!

ڪي نقاد اياز جي ٻوليءَ لاءِ چوندا آهن ته اها عوامي ڪانهي، ان ۾ گوناڻي ٻوليءَ وارو ساءُ ڪونهي، اها بي ساختگي ڪانهي، جهڙي استاد بخاريءَ، ابراهيم منشيءَ يا سرويج سجاوئيءَ جي شاعريءَ ۾ آهي. بيشڪ اهي ۽ اهڙا ٻيا شاعر به تمام اهم آهن ۽ سندن ٻوليءَ ۾ اها خوبي بدرجه اتر موجود آهي، پر ڏٺو وڃي ته اهي هڪ ته اياز جا ننڍا همعصر آهن، ٻهراڙين سان تعلق جي ڪري سندن ٻوليءَ ۾ اهو ساءُ آهي پر شيخ اياز جا ٽارگيٽ آڊيئنس به ته ڪانئن مختلف آهن، شيخ اياز جي شاعريءَ جا مخاطب وقت جي مناسبت سان ڪاليجن ۽ يونيورسٽين جا شاگرد، استاد، اديب ۽ پڙهيل ماڻهو هئا. جن جي ذهني تربيت ۽ سجاڳيءَ جي ضرورت هئي، ون يونٽ جي قهري قانون جا اثر ۽ نتيجا انهن ٻڌائڻ ضروري هئا، منجهن اهڙو شعور پيدا ڪرڻو هو جيڪو کين جدوجهد ڪرڻ لاءِ اپاري، ان کان سواءِ ڇو ته انهيءَ مڊل ڪلاس طبقي جون پاڙون ڳوٺن ۾ هيون ان ڪري انهيءَ انقلابي پيغام جو اثر اوس عوام تي به ٿيڻو هو ۽ ٿيو به، ۽ ائين هو سنڌي ٻوليءَ جو 20 صديءَ جو وڏو ۽ وڏو شاعر بڻيو:

ڪي ماڻهو تاريخ ٿين ٿا  
گهايل ڌرتيءَ جي سڀني تي  
اهڙي گهري چيخ ٿين ٿا  
جاهر ڪنهن کي جاڳائي ٿي  
۽ دنيا کي بدلائي ٿي.

اهڙي قومي شعور سان گڏ هن پيڦاتي ننڍ وڏائيءَ جو شعور به پنهنجي ان انقلابي شاعريءَ ۾ ڏنو ۽ سنڌي ٻوليءَ جي وسعت جو يقين



ڏياريو ته ان ۾ تصوف ۽ ويدانت کان پوءِ ٻيا به ڪيئي فڪر ۽ فلسفا، نظريا ۽ تصور، رومانس ۽ جماليات سمائڻ جي شڪتي آهي.

فيض احمد فيض به عوامي ڪونه هو، سندس ٻولي ته بلڪل عوامي ڪانهي بلڪ اها رڳو انتليڪچوئلس يا دانشورن کي سمجهه ۾ ٿي اچي، ڪو عام ماڻهو سندس ڪوبه ڪتاب ڪڏهن به ڏيکڻ ۽ پڙهڻ ۾ ڪانهي، ها البت سندس طبقاتي شعور ڏيندڙ، مخصوص نظر انهن دانشورن جي توسط سان زبان زد عام ٿيا آهن يا اقبال بانو ۽ فريده خانم جهڙن فنڪارن ڳائي مشهور ڪيا آهن ۽ جيئن ته انهن جو پيغام طبقاتي جدوجهد ڪندڙ حلقن جي وسيع دائري ۾ قبوليت حاصل ڪري چڪو آهي ۽ اهي ان کي قومي ٻولي، پرورجائيندا رهن ٿا، ان ڪري سموري پڪستان ۾ هن کي مڃتا ۽ پذيرائي ملي آهي. سوچيو ته جيڪڏهن فيض احمد فيض اها شاعري پنهنجي مادري ٻولي، پنجابيءَ ۾ ڪري ها ته ملڪي سطح تي يا دانشورن جي معرفت عالمي سطح تي ايترو ڄاتوسجياتو وڃي ها؟ ان جي پيٽ ۾ شيخ اياز نج سنڌي ٻوليءَ ۾ شاعري ڪئي ۽ ان ۾ پيش ڪيل وطن دوستيءَ ۽ انسان دوستيءَ جو پيغام عام ماڻهو، کي سمجهه ۾ اچي ٿو ۽ ان ۾ پيش ڪيل بين الاقوامي نظريا يا فڪر نوجوانن جي ذهني سطح ۾ اضافو ڪندا رهيا آهن ۽ جيئن ته هن پنهنجي شاعريءَ ۾ سنڌ جي قديم تاريخي شعور کي قلمبند ڪرڻ سان گڏ مشرق ۽ مغرب جي عظيم تخليقڪارن جا فڪر انگيز ۽ دل ۽ دماغ کي اجاريندڙ خيال ۽ نظريا به سنڌيءَ ۾ آندا. ائين پنهنجي وسيع مطالعي ۽ مشاهدي جو سمورو نچوڙ يا رس به سنڌيءَ ۾ اوتيو ۽ ٻوليءَ کي شاهوڪار ڪيو ۽ سماج کي نئين جاڳرتا سان روشناس ڪرايو. آءٌ پر پوءِ به ملڪ ۽ سرڪاري سطح تي کيس فيض جهڙي مڃتا ڪانه ملي. فيض، فراز، اقبال، احمد نديم قاسمي، يا مٿي پنهنجي مادري زبان ڇڏي اردوءَ ۾ شاعري ڪئي، پاڪستان جون اخبارون، ٽيليويزن چئنل ۽ قومي ادارا انهن بابت سيمينار، ڪانفرنسون، ميلا، ۽ ٻيا پروگرام ڪري کين قومي سطح تي اپاريندا رهيا، جڏهن ته اياز محض هڪ ”علائقائي زبان“ جو شاعر سمجهيو ويو جنهن تي صرف سنڌ جا ادارا ۽ سنڌي چينل (”علائقائي زبان“ جا چينل) پروگرام ڪري سگهن ٿا. (سنڌي چينلن کي ڌاريلن، ڪارو ڪاريءَ ۽ ڪهاڙي ڪلچر مان واندڪائي ملي ته اهي ڪڏهن ڪڏهن اهو فرض پورو ڪري سگهن ٿا) پر آءٌ اهو پڪ سان ٿي چوان ته مڃتا هڪ طرف ۽ محبت ٻئي طرف، سنڌ جي ماڻهن اياز سان جهڙي محبت ڪئي اهڙي انهن سرڪاري سطح تي مڃيل شاعرن کي ڪانه ملي

هوندي ... هائي ته انهن جي باري ۾ سوال اٿڻ لڳا آهن، انٽرنيٽ تي اهڙا  
ڪيترائي مقالا، مضمون ۽ بلاگ موجود آهن !!

ٻئي طرف شيخ اياز جي اردو شاعريءَ کي به هنن ڪڏهن ”درخور  
اعتنا“ يا ”قابل غور“ ڪونه سڃاڻيو ۽ ليکيو به ڪونه ڇو ته هنن لاءِ هو  
بنيادي طور سنڌي شاعر هو. اڄ ڪلھ امداد حسينيءَ کي اردو شاعرن ۾  
گھرايو وڃي ٿو، سندس هڪ ڪتاب کي اڪادمي طرفان ايوارڊ به ڏنو ويو  
آهي، جيڪو سندس اردو شاعريءَ جو مجموعو آهي، امداد سنڌ جو موجوده  
دور جو تمام وڏو شاعر آهي، منفرد ڊڪشن جو مالڪ آهي، سندس اردو  
شاعري به ڪمال جي آهي پر هڪ نجی محفل ۾ هڪ اردو شاعر ان جو  
بحث ڇيڙيو ته ڇا اردوءَ ۾ امداد کان بهتر شاعري ڪانه پئي ٿئي جو ان کي  
اهو ايوارڊ ڏنو ويو، ان ۾ به ڪا سياست نه ڪانهي؟ مون کي سچ ته ڏاڍي  
حيرت ۽ افسوس ٿيو، امداد جهڙو سنڌيءَ جو باڪمال شاعر اردو شاعرن  
جي هجوم ۾ هڪ ٻيو شاعر، مخلص هڪ واڌارو سمجهيو وڃي! اياز ته  
گھڻو وقت اڳ ان تعصب کي محسوس ڪري ورتو هو ۽ اردو ڇڏي سنڌيءَ  
۾ شاعري ڪيائين ۽ لکيائين ته:

”تون شاعر حفت زبان آهين  
ڇا توکي معلوم نه آهي ته  
شاعريءَ کي فقط مادري زبان ۾  
منطقي نتيجي تي پهچائي سگهيو آهي!  
مادري زبان کان سواءِ  
ٻي زبان ۾ شاعري ڇڏي ڏي  
ڇا توکي خبر نه آهي ته  
پنهنجي ماءُ کان سواءِ ٻيون ماڻهون  
ماتنجيون ٿينديون آهن!“

اهوئي سبب هو جو هن گھڻ پڙهي شاعر جي فڪر ارتقا جا سڀ گس  
پنڌ ۽ مرحلا کيس پنهنجي جنم ڀوميءَ، سنڌ ڏانهن ٿي وئي آيا ۽ ائين هو  
سنڌ جي زبان جي ماڏير يا وسيلي سان سموري سنڌي قوم جو ترجمان  
بنجي ويو ۽ سندس شاعريءَ، سنڌ جي قومي شاعريءَ جو درجو ماڻيو ۽ سنڌ  
مٿس فخر ٿي ڪري، اياز جي ٻوليءَ پنهنجو تاريخي ڪردار ادا ڪيو ۽ اهو  
ڪارج سر ڪيو جيڪو لطيف پنهنجي دور ۾ ڪيو جو کانئس پوءِ جا  
اکثر شاعر سندس ڊڪشن کي شعوري توڙي غير شعوري طور اختيار  
ڪندا رهيا.

شيخ اياز وٽ سنڌي ٻوليءَ جا ڪئين روپ سروب آهن، ڪئي هو  
 نچ سنڌي علامتون ٿو استعمال ڪري ته ڪٿي معياري علمي ادبي ٻولي ٿو  
 استعمال ڪري، ڪٿي لوڪ جي شاعري آهي ته ڪٿي دانشورن لاءِ انقلابي  
 ۽ سماجي حيثيت سان پرپور اظهار آهي هي سٽون ڏسو:  
 ”ڏيهه نه آئي ڏانءُ“، ”انڙيون ڳول نه چورا ڏينهن ٿي ۾“ ”اوءِ  
 ڪجري گجر، پير هوريان ته ڌر“، ”شال دولهه ٿين، شال دودو ٿين، سنڌ تي  
 سرڏين“ (لولي) هنن گيتن ۾ سنڌي ٻوليءَ جو نجپڻو پترو آهي ۽ خالص  
 سنڌي ٻوليءَ جي سونهن من موهي ٿي وجهي، جنهن جو ميناج چين ۾ ٿو  
 محسوس ٿئي. بقول سائين ابراهيم جويي جي:  
 ”تاريخ ۽ سياست جي هڪ شاعر جي حيثيت ۾ پنهنجي فڪري  
 اظهار لاءِ سنڌي ٻوليءَ جي انهيءَ سموري مروج اصطلاح جي تشبيهي ۽  
 علامتي ذخيري ۾ اياز ڪافي اضافو ڪيا آهن ..... اهي علامتون نيٺ سنڌي  
 آهن، جيڪي هن پهرين ڀيرو ڪم آنديون آهن“ (ص 30- ساڳيو حوالو)  
 جويي صاحب اهڙن ڪيترن لفظن جا مثال لکيا آهن، جن مان ڪي  
 هي آهن: گوري، جگري، پلرپيٺڻ، ٻاٽ اوندهي، ڳاڱيون، ڳر ڳنڍير، رابيل،  
 سوخ گلاب وغيره! اياز جي ڪتب آندل ڪيترن نچ سنڌي لفظن کي اسان  
 جهڙا شهري ماڻهو يا هڪ کان ٻيو لهجو ڳالهائيندڙ مٿي نه سمجهي  
 سگهن، ان ڪري ڪن ڪتابن ۾ انهن جون معنائون به ڏنيون ويون آهن.  
 شيخ اياز کي قدرت اهڙي اک ڏني هئي جيڪا ان ڏٺو ڏسي ٿي  
 سگهي. هن سنڌ جي ماضيءَ کي ته ڄاتوئي پر حال جي برحاليءَ جو به  
 ادراڪ هئس ۽ تمام ننڍي عمر ۾ انقلاب جي اهميت کان واقف ٿي پنهنجو  
 اهو مشهور نظر چيائين جيڪو اڄ به اوتري RELEVANT آهي:

انقلاب انقلاب ڳاءِ، انقلاب ڳاءِ  
 جئين زمين ۽ آسمان جي ڪلي پئي زبان  
 ڪنڊ ڪنڊ، چونڪ چونڪ  
 شهر شهر، چونڪ چونڪ  
 جئين ڏٺي اٿي جواب - انقلاب!  
 وري سٺ جي ڏهاڪي ۾ ون يونٽ جي رد عمل ۾ ڪيل شاعري  
 قومي تراني جو ڪم ٿي ڪيو:  
 سهندو ڪير ميار او يار!  
 سنڌڙيءَ تي سر ڪير نه ڏيندو



ڪالهه هيا جي سرخ گلابن جيئن  
 اڄ ڪلهه نيلا پيلا آهن  
 گيت به چڻ گوريلا آهن  
 جي ويري، تي وار ڪرڻ ٿا  
 جيئن جيئن جاڙ وڌي ٿي جڳ ۾  
 هو ٻولي، جي آڙ چپن ٿا.

ڪنهن اوچي آدرش کي ماڻڻ لاءِ ٿيندڙ ووڙ ۽ ولوڙ اياز کي سک  
 سمهڻ نٿي ڏنو. هن پنهنجي ڪتاب ”يونر پري آڪاس“ جي ”پيش لفظ“ ۾  
 لکيو آهي ته:

”مون سنڌي بيت کي تصوف ۽ روايتي شعر جي ڍير مان ڪڍي  
 اچو اجرو ڪري نئين رنگ ۽ روپ ۾ پيش ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي آهي.  
 منهنجي واين جي هيٺ ۽ موضوع ٻئي جدا گانه ۽ جديد آهن. هر عظيم  
 شاعر جي روح ۾ سندس پوري ماضي، ۽ ان جي فني تخليقات، روايات،  
 فلسف حيات جون جڙون آهن، جي هن جي شاعريءَ جي نشو نما ڪري، ان  
 کي شگفته ڪنول روپ ڏين ٿيون ۽ هن جي فن ۽ فڪر جي انفراديت  
 پئونر جيئن پرندي آڪاس ۾ اڏامندي ٿي رهي، جڏهن ٻنهي سنڌي ڳالهه  
 راس ٿي اچي، تڏهن فني شهپارو تخليق ٿئي ٿو.“

مٿئين بيان مان واضع ٿئي ٿو ته هو مثبت روايت کان انڪار نٿو  
 ڪري به مصنوعي روايت جو انڪار آهي. سنڌ سان پنهنجي ڪمٽمينٽ جو  
 اظهار اڳتي وري هن ريت ڪيو اٿس.

”سنڌ، جنهن جي هر سنگ لحد هيٺان تاريخ پوريل آهي ۽ جنهن کي  
 تاريخ جي صفحن تان ميسارڻ وڌي ۾ وڏي حمايت ٿيندي. اها مون کي جند  
 جان کان وڌيڪ پياري آهي، اها نه رهي ته سنڌي ٻولي ڪٿي هوندي ۽  
 منهنجي شاعريءَ جي اهميت ڪهڙي رهندي؟“ (ساڳيو حوالو)

اهوئي سبب هو جو هن اهو سڀ ڪجهه پنهنجي شاعريءَ ۾ آندو  
 جيڪو سنڌي هو، سنڌ سان منسوب هو: هتان جا گل ڦل وڻ ٺڻ، پکي پڪڙ،  
 ماڻهو چيڻو، پهاڙ جبل، نئون نديون، ڍنڍون ڍورا ۽ ڪراچيءَ جو سمنڊ!  
 ان ڪري هوصرف 20 صديءَ تائين محدود ڪونه رهندو پر ايندڙ ڪيئي  
 صدين جو آواز ٿي رهندو، جيڪو سنڌ کي سيڪيولر، ترقي پسند ۽ روشن  
 خيال سنڌ بنائي ٿو. سندس شاعريءَ ۾ نه صرف فڪري سونهن آهي پر ان  
 ۾ انسانيت جا دائمي قدر موجود آهن. هن وٽ سچ جي وڏي اهميت آهي:  
 ذات وڌي شيءَ ناهي



پر سچ وڏي شي، آهي  
 ۽ جو سچ مڃائي  
 سو سچ وڏي شي، آهي  
 ۽ انسانيت سڀ کان وڏو سچ آهي جنهن جو پرچار هن ڪيو:  
 جنهن تي به ٿيو، جنهن وقت ٿيو، جنهن جاءِ ٿيو  
 سو مون تي ظلم ٿيو آهي.  
 ڪا ٻانهن وڏي، مون دانهن ڪٿي، جو ڪانهن ڪيڀو  
 سو منهنجي ڪنڌي، جو آهي.  
 ڪوئي به ڪٿو، جيڪو به چرو، جنهن تي به هليو  
 سو منهنجو رت رتو آهي.  
 تاج جويي پنهنجي ڪتاب ”مان ورتو هان، مان ورثو هان“ لکيو آهي

ته:

”اياز جي شاعريءَ جي ٻولي پٺاڻيءَ جي وحدت الوجود جي ٻولي  
 آهي ۽ ان جي حسناڪي، سان جديد دور جو ورلي ڪو شاعر برميچي  
 سگهيو آهي. اياز جي ٻوليءَ جو حسن پنهنجو آهي، جنهن کان انڪار  
 ڏينهن جي روشن، کان انڪار آهي (ص 46) هن ڪي ميڄڻ ڄڻ ته مجبوري  
 ٿي پوندي، پاڻ چوي ٿو:

تون جو مون کي ڪين مڃيندين  
 مون کي ڪا پرواهه نه آهي  
 آءُ سڀاڻي لاءِ لکان ٿو  
 جيڪو نيٺ ته اچڻو آهي  
 مون تي ميڙو مچڻو آهي.  
 شيخ اياز ان سڀاڻي ۽ اسان جي اڃ لاءِ پُر اميد هو جنهن ۾ هو اچڻو  
 آهي چوي ٿو:

نٿي جي رابيل ۾ وري ڪڙندس مان،  
 وري ٽڙندس مان مڪلي تنهنجي ماڻ ۾.  
 اڃا اسان جي منزل پري آهي بس رڳو صحيح مارڳ تي ڳا درست دڳ  
 تي رهون ته به غنيمت آهي اهڙي ڪيفيت ۾ چوي ٿو:  
 تون ملين، مون کي ته سارو جڳ مليو، ٻيو ڇا ڪپي! منهنجي سڪي  
 ماڳ ڏاڍو آ پري، جي دڳ مليو ٻيو ڇا ڪپي! منهنجي سڪي  
 شاهه لطيف وٽ به منزل کان اڳ مسيح مارڳ جي اهميت آهي  
 چوي ٿو:

”وڏا طالع تن جي مارڳ منجهه مرن“ - هو ان فلسفي کي ڪيترن  
بيتن ۾ بيان ڪري ٿو:

اڳي پوءِ مران، مر مران مارڳ ۾  
مٿي پوءِ پريان، خون منهنجو جيڏيون.

درست دڳ تي رهيو ته منزل اوس ملندي! بس من ۾ جوت جلائي  
آهي، جذبو جا ڳائي رکڻو آهي. شيخ اياز هيئن ٿو چوي:  
ڄاڻ پرھ جا پنڇي اڏريا  
توڙي پوئين آهي ويرا  
منهنجي جوت اڃا به ڀري ٿي  
اڃا تڪيان ٿو تنهنجا پيرا.

اسان جي هن حال جو (جيڪو اياز جو مستقبل هو) جيڪو حال  
آهي، ان ۾ اڃا به سنڌ کي، سنڌي ٻوليءَ کي ڪيئي چئلينج درپيش آهن. اڄ  
ضرورت ان ڳالهه جي آهي ته انهن بابت سوچجي، غور ۽ فڪر ڪجي، 21  
صدي سائبرايڇ جي صدي آهي، سڄي دنيا هڪ ڳوٺڙو، گلوبل وئيج بشجي  
وئي آهي. گلوبلائيزيشن جو راکاس قومن، ٻولين ۽ ثقافتن جي ڪڍ پيل  
آهي، ان سان منهن ڏيڻ لاءِ اسان کي به هٿيار بند ٿيڻو پوندو، اهڙن سمورن  
هٿيارن سان جيڪي اهو استعمال ڪري رهيو آهي، ڪمپيوٽر انفرميشن  
ٽيڪنالاجي، سوشل ميڊيا، ابلاغ جا جديد طريقا، جديد علم، ٻوليءَ جي بچاءَ  
لاءِ ڪسپوٽيشنل لنڪسٽڪس، لينگويج انجنيئرنگ وغيره.

اڄ اسين ڏسون ٿا ته سنڌي سماج ڪيڏي تيزيءَ سان تبديل ٿي  
رهيو آهي، انسان براڻڇ جا اثر قبول ڪري رهيو آهي، ڄاڻ جا وسيلو مائٽي  
رهيو آهي، هر قسم جي تبديلي ۽ ترقي ماڻهوءَ جي نفسيات تي به اثر  
ڪري رهي آهي، ثقافت ۽ تهذيبي قدر بدلجي رهيا آهن. تهڻا سنڌي ٻوليءَ  
تي اثر ڪونه ٿيندو؟ يقيناً ان ۾ به تبديلي ايندي ۽ مثبت تبديليءَ کان ڊڄڻ  
نه گهرجي، باقي اڃائي ڪار ۽ بگاڙ کان ان کي بچائڻ ضروري آهي ڇو ته  
ٻولي قوم جي سڃاڻپ به آهي ته تهذيب ۽ ثقافت جي امين به ٿيندي آهي،  
ان ۾ صدين جي ڏاهپ سانديل هوندي آهي.

خوشيءَ جي ڳالهه اها آهي ته سنڌي ٻولي هن وقت ڪمپيوٽر  
ٽيڪنالاجيءَ سان هر آهنگ ٿي رهي آهي، گوگل ٽرانسليشن ۾ آيل آهي،  
UNIVERSAL DEPENDENCY FREMEWARK ڊجيٽل ٻوليءَ جي حيثيت ۾  
قبول ٿي چڪي آهي، ان ۾ او سي آر، سارٽنگ اسپيڇ ٿو ٽيڪسٽ ۽

ٽيڪسٽ نو اسپيڳج جي پراجيڪٽ تي ڪم هلي پيو، وڪي پيڊيا ۽ پٽاڻي پيڊيا جهڙا سرچ انجڻ ڪم ڪن پيا، 11-2012 کان ان لائين سکيا جا پروگرام مختلف سائينس تي موجود آهي. ڊجيٽل لائبريريون تخليق ٿي چڪيون آهن، شاھ لطيف جو رسالو اڳ ۾ پي ڊي آيف ۾ موجود هو هاڻي ڊجٽ لائيز ورزين تي ڪم پيو ٿي، جنهن ۾ معنائن ۽ تشريح سان رسالو رکيو ويندو، وجود تان خطرو ٿري ويو آهي پر ته به اسان کي ڪوششون جاري رکڻ گهرجن، شيخ اياز جي حوالي سان سندس سموري نثر ۽ نظر کي ڊجيٽلائيز ڪرڻ جي ضرورت آهي (۽ ٻئي سموري ادب لاءِ پڻ ساڳي ڳالهه چئي سگهجي ٿي) جن نوجوانن کي سندس اهميت جي ۽ عظمت جي خبر ڪانهي، انهن کي ڪمپيوٽر ذريعي اها ڄاڻ ڏئي سگهجي ٿي. موجوده دور ۾ اهو ممڪن ڪونهي ته جديد ٽيڪنالاجي، ۽ سائنس توڙي سوشل سائنسز جا سمورا ڪتاب ترجمو ڪري سنڌي ۾ پڙهايا وڃن (سواءِ ڪجهه ابتدائي ڪتابن جي جيڪي پرائمري ۽ ۾ مادري ٻوليءَ ذريعي پڙهندڙ ٻارن کي ڪم اچن، باقي هائير يا اعليٰ تعليم جو مڊيئر هون، به انگريزي رهندو اچي) البت شاگردن ۽ استادن جي سهولت ۽ سمجهه لاءِ انهن مضمونن جون سبجيڪٽ ڊڪشنريون جوڙجن ۽ انهن جي. ان لائين پهچ به هجي ان جي ابتدا به 2013-4 ۾ ٿي چڪي آهي ۽ ميڊيڪل ۽ ٻين سائنسي مضمونن جون ڊڪشنريون نه صرف ڇپايون ويون آهن، پر ان لائين به آهن. گوگل ۽ ٻين ذريعن سان ترجمي جو ڪم ٿيو ته به سائنسي ۽ ٽيڪنالاجي جي مخصوص اصطلاحن (TEAM) جو ترجمو ڪرڻ ممڪن نٿو لڳي، سو آهي جيئن جا ٽيئن رکجن ته جيئن شاگرد شاگردياتيون انهن کان مانوس هجن، البت ماهر انهن جا متبادل محض سمجهائڻ لاءِ ترجمو ڪن ۽ لغتن ۾ داخل ڪن.

ٽيليويزن چئنلن کي تعليمي مقصدن لاءِ استعمال ڪجي، تعليم ۽ سنڌي ادب بابت انهن چئنلن تي پروگرام هلائڻ سان انهن بابت شعور ۾ واڌارو ٿيندو (هن وقت انهن تي رڳو سياست ۽ جهيڙا جهٽا ٿا هلن) اهڙيءَ ريت اليڪٽرانڪ ميڊيا، سوشل ميڊيا، انٽرنيٽ جي سمورن ڄاڻ جي ذريعن ۾ سنڌي ٽيڪسٽ فارميٽ ۾ ڪجهه اچي وئي آهي ۽ ڪجهه اڃا ايندي ته ڪو سبب ڪونهي جو ان جي وجود کي ڪو خطرو رهي. سڀ کان وڏي ڳالهه ته جيڪڏهن آٽوميٽڪ ٽرانسليشن سان گڏوگڏ ٽرانسليٽريشن (لپي بدل) وارو عمل مڪمل ٿيو ته سڄي دنيا جا سنڌي ٽنلپين ۾ سنڌي ڪتابن کي اٽلائي پڙهي سگهندا جيڪي هونديون موجوده عربي، لپي، ديونا گريپي ۽ رومن لپي، ان قسم جي ڪم جي ابتدا به اسين 2014 ڌاري ڪري

چڪا آهيون ۽ اهڙو پراجيڪٽ هن وقت آخري مرحلي ۾ آهي، پوءِ ته قاضي قاضن کان شاھ لطيف ۽ سمورا ڪلاسيڪي شاعر هر ڪو پڙهي سگهندو ساڳي طرح ڪشنچند بيوس کان شيخ اياز، ۽ ان کانپوءِ جا جديد شاعر به ڪمپيوٽر جي هڪ ڪلڪ يا تڙڪ سان نوجوان پاڻ به سگهندا ته لکي به سگهندا. سو چئي سگهجي ٿو ته هاڻي سنڌي ٻوليءَ تان خطرو گهڻي قدر ٽري ويو آهي! پر تڏهن به ماڻ ڪري ويهڻو ناهي. مختلف دورن ۾ ڪيترين ڪوششن باوجود سنڌي ٻوليءَ کي قومي ٻولي ته ٺهيو پر سنڌ جي سرڪاري دفترن ۾ ٻوليءَ وارو آئيني حق ۽ درجو ڏيڻ لاءِ وس وارا تيار نٿا ٿين. جنهن لاءِ نه صرف فرد، ادارا، تنظيمون ۽ اسيمبلين جا ٺهراءُ گواه آهن پر وري ڪجهه به ڪونه، ان ڪري ضروري آهي ته اڪيلي سر نه پر پاڪستان جي ٻين ماءُ ٻولين جي ڳالهائيندڙن کي به ان ڪوشش ۾ شريڪ ڪجي ۽ گڏجي اها تحريڪ زنده رکجي!

(28 ڊسمبر 2020 تي ڇهين اياز ميلي جي موقعي تي پڙهيل)

#### مددي ڪتاب:

- مون ذات انوکي آندي آ، محمد ابراهيم جويو، ثقافت کاتو، حڪومت سنڌ، ڪراچي 2012ع
- مان ورثو هان، مان ورثو هان، تاج جويو، مارئي اڪيڊمي سڪرنڊ/حيدرآباد سنڌ 2000ع
- شيخ اياز جي شاعريءَ جا مجموعا، ”پنور پري آڪاس“ ۽ ٻيا، پبلشر، ثقافت کاتو، حڪومت سنڌ، ڪراچي



## پلاٽ کان بغير دنيا جي ڪهاڻي

(رسول ميمڻ جي ڪتاب الف کان اڳ تي تبصرو)

فلسفي جي دنيا به ڏاڍي عجيب آهي، يا ته سمجهه ۾ نه ايندي يا وري ايترو سرور بخشيندي ٿي جو ٻي دنيا ٿي وسري وڃي. مون کي تمام گهٽ ڪتابن متاثر ڪيو آهي. پر جيڪي ڪتاب متاثر ڪندا آهن اهي ورور ڏيئي پڙهندو آهيان ۽ انهن جي هڪ هڪ سٽ پڙهي روح ۾ تحليل ڪندو آهيان ته جيئن ته لفظن جي تعبير ۽ مان خط وٺي سگهان.

رسول ميمڻ جو ڪتاب به اهڙن ڪتابن مان هڪ آهي. سنڌي ۾ اهڙا ڪتاب ته گهٽ ملندا آهن. جن جي پٺيان ڪائنات جيڏو تخليل ۽ علم جي معرفت هجي. سچ پچ ته فلسفي جي موضوع تي عام طور ڪتاب رڳو شخصيتن يا واقعن تي پرايا پيا آهن. اصل منطق ۽ سمجهاڻي ملي ڪانه ٿي.

رسول ميمڻ جي هن ڪتاب پڙهڻ وقت مون هر سٽ تي بيهي وري وري سوچيو آهي. ڇو ته مون فلسفي جي انهن سڀني سوالن تي بار بار سوچيو آهي. ڇڻ ته هن ڪتاب ذريعي مون کي پنهنجي دل جي تنهائي دور ٿيڻ جو موقعو مليو. رسول ميمڻ هي مختصر ڪتاب لکيو آهي جنهن ۾ نهايت سادا موضوع شامل آهن پر دراصل هي ڪتاب جيترو مختصر آهي اوترو سمنڊ جيترو وسيع موضوعن ۽ منطقي حيراني سان ڀريل آهي. فلسفي جي شوقينن لاءِ هي ڪتاب ڪشش جو باعث آهي. هن ڪتاب جي خصوصيت هي آهي ته فلسفي کي جانبداري کان بچايو ويو آهي. فلسفي کي فيصلو ڏيڻ کان بچايو ويو آهي. فلسفي کي اميد يا نا اميدي کان بچايو ويو آهي.

فلسفي جو بنيادي سوال اهو آهي ته دنيا معروضي آهي يا موضوعي. پر رسول ميمڻ جي بقول ته ”جي حقيقت موجود هجي ته دنيا جو مسئلو ٿي حل ٿي وڃي ها.“ پر ”معروض ڪنهن مسخري جي هٿ ۾ جهليل بصر جي ڳنڍ آهي، جيڪو ڪڏهن روئي ٿو ڪڏهن کلي ٿو. بصر جي هر ڪل پٺيان

ٻي ڪل آهي آخر ۾ خالي پڻو آهي“ اصل ۾ اهو خالي پڻو سمجھڻ ئي معروض کي سمجھڻ لاءِ ضروري آهي. رسول ميمڻ اهو ئي ڪم ڪيو آهي. ته ناول انداز ۾ پنهنجي موضوعي سوچ سان فلسفي جي منطق کي اڳتي وڌايو آهي جڻ رسول ميمڻ هڪ منجهيل ڳوڙهي وجود ي بحران کي ڪڍي فلسفياڻي سوچ سان معروض جي هُن پار کي سمجھڻ جي ڪوشش ڪندو هجي.

ڇا معروض آهي؟ ڏيوڊ هيوم جي مطابق ته معروض آهي ئي ڪونه؛ جيڪي ڪجهه ڏسجي ٿو اهو خاصيتن جو ڏير آهي. خاصيتون اسان جي موضوعي خاصيتن جن ڏير آهن پر خاصيتن کان بغير ڪوبه وجود ناهي. تنهن ڪري معروض جي سڃاڻپ به موضوعي آهي. ڪارل مارڪس صرف معروض کي ئي حقيقت قرار ڏنو ۽ هن معروض کان ٻاهر ڪنهن شيء جي هئڻ کان انڪار ڪيو. حقيقت ۾ مارڪسزم جا ٽي عنصر آهن. هڪ مارڪسي فلسفو ٻيو سياسي معاشيات ٽيون سائنسي ڪميونزم. مان سمجهان ٿو ڪارل مارڪس جي فلسفي جي انهيءَ نڪتي ۾ جبريت آهي ته مادو ئي ڪائنات جو آخري حقيقت آهي. باقي سياسي معاشيات ۽ سائنسي ڪميونزم اڄ به سائنس جي حيثيت رکن ٿا. پر فلسفي ۾ فتوا صادر ڪري نٿي سگهجي انهيءَ جو اصول ئي اهو آهي ته سوال اٿاري، شڪ اٿاري. سائنس کي فلسفي جي ضرورت هوندي آهي جو فلسفي کي ڏند ڪٿا کان ڌار سائنس ڪندي آهي. تنهن ڪري ڪارل مارڪس تائين جي دور جي سائنس 1880ع تائين واري هئي ان کان پوءِ ميڪس پلانڪ، نيل بوهر، آئنسٽائن، ڪارل سائگن، اسٽيفن هڪنگ وغيره آيا جن سائنس ۾ انقلاب آندو ان مطابق ڪوانٽم ٿيوري سوچ جي رخ کي نئون موڙ ڏنو. ڪائنات جي مائڪرو دنيا کي ۽ ميڪرو دنيا کي سمجھڻ جو نئون انڪشاف ٿيو. جنهن ۾ ڪوانٽم فزڪس جي ڪائنات جي بنياد بابت بنيادي سوال انرجي يا مادو بابت اڻ ٿڙ ۽ غير يقيني جي دنيا متعارف ڪرائي ٿي. سوال اهو آهي ته ڪٿي انسان خواب جو خواب ته ناهي، يا پاڇي جو پاڇو ته ناهي. ڪٿي مادي وجود ناهي دنيا ته ناهي، ائين ته ناهي ته اڪيون انسان کي بيٺا بچاءُ ناهي ڪن ٿيون. روشني جي دنيا صرف ڪائنات جو هڪ پاسو آهي. باقي پاسا نيستي nothingness ۾ آهن. ڪٿي ائين ته ناهي ته اسان مادي وجود ۾ لڪل آهيون بلڪل ائين جيئن ائٽم ۾ انرجي لڪل آهي. اسان به انرجي جي اهڙي شڪل آهيون جيڪا ظاهري دنيا ۾ نروار ناهي. هميشه اصل وجود لڪل آهي ٿورو غور ڪنداسين ته صوف ميوو آهي، ڪيلو

ميون آهي، انب ميون آهي پر اصل ميون ڪٿي لڪل آهي ڇو ته ميون پاڻ کي انب جي صورت ۾ ظاهر ڪيو آهي. صوف جي صورت ۾ ظاهر ڪيو آهي. پر ميون انب ۾ لڪل آهي، صوف ۾ لڪل آهي ڪيائي ۾ لڪل آهي. بلڪل ائين مان پاڻ پنهنجي بدن ۾ لڪل آهيان. يا مان ڪٿي نستي ۾ آهيان صرف بدن تي حڪم پيو هلايان. رسول ميمڻ مختلف فلسفين جا مثال ڏيندي انهيءَ بحث کي نپائي ٿو. چوي ٿو:

”مان پاڻ ۾ موجود آهيان يا ”پاڻ“ مون ۾ موجود آهي. پر سونهن کان سواءِ ڪجهه نه آهي. سونهن موضوعي آهي. انڪري نستي آهي. سارتر چوي ٿو هڪ خال آهي، نستي آهي، زندگي نستي جو وجود ۾ اچڻ جي ڪوشش آهي. انهيءَ خال کي پرڻ جي ڪوشش آهي. وجود پهرين پنهنجو سامهون دهشت، موت، ڪراحت، بوريت، ۽ خود فريبي سان ڪري ٿو. پوءِ جوهر ڳولڻ جي ڪوشش ڪري ٿو. پر ڪو به جوهر ناهي معنيٰ ڪائنات بي معنيٰ آهي. انسان جو سڀ کان وڏو الميو اهو آهي. تنهن ڪري گوتم ٻڌ چيو هو ”سرور دڪر دڪر.“

انهيءَ مضمون ۾ رسول ميمڻ آخر ۾ چوي ٿو ته ڪائنات جا منظر منهنجي انڪري مدد نٿا ڪن جو مان نظرين جي تجريد ۾ ويائجي، غير واضح معروض بڻجي چڪو آهيان.

بلڪل ائين زندگي پلاٽ لیس ناول آهي. جنهن مان ڪيترائي صفحا ڦاڙي ڇڏجن يا ڪيترائي ئي ڪردار ڪڍي ڇڏجن ڪو فرق نٿو پوي. اتان صوفي مت جي چڻنگ ڏکي ٿي. رسول ميمڻ چوي ٿو

”خدا حقيقت کان مٿانهون ادارڪي معروض ناهي پر تصور آهي. جيڪڏهن خدا کي حقيقت ۾ بيان ڪجي ته بت پرستي ٿي پوندي. تصور ڪنهن به معروض ناهن کان عاري آهي خدا نستي جي انتها تي پهچي تصور ۾ عظمت ماڻي ٿو.“

صوفي انهيءَ تصور جي انتها کي حقيقت چوي ٿو وجودين وٽ به مطلق حقيقت ۽ نستي ساڳي ڳالهه آهي. جڏهن ته تصور جي اڌار انهيءَ حقيقت تي نٿي پهچي پيو ته مادي دنيا جي ڪنهن به علم سان اسان انهيءَ تصور جو ادراڪ نٿا ڪري سگهون. انهيءَ ڪري شاھ لطيف چيو هو

”جنهن کي جتان پرين پاڻ پسايو، تنهن کي تتان ليئا پائڻ آيا“

سچل سرمست چيو هو؛  
مين تان ڪوئي خيال آن  
مسلمان نال خيال دي.



رسول ميمڻ صاحب هڪ ٻيو مضمون خلل (delusion) آهي. جيڪو نفسياتي فلسفو آهي. جيڪو نه صرف معلوماتي آهي بلڪ حقيقت جي فلسفي کي سمجهڻ لاءِ انتهائي ضروري آهي. خلل جي بجاءِ مان ان کي وهر ٿو چوان ڇو ته خلل ۾ ڪيتريون ئي نفسياتي بيماريون اچن ٿيون پر وهر صرف هڪ بيماري آهي. وهر جا ڪيترائي قسم آهن.

Illusion

Delusion

Hallucination

وري انهن جا مختلف قسم آهن.

دنيا جيڪڏهن مايا آهي، تصور جو پاڇو آهي، ته پوءِ اسان هڪ وڏي وهر ۾ مبتلا آهيون. بلڪ موروثي طور شيزوفرينڪ آهيون. اها ئي ڳالهه ايرڪ فراهر ڪئي هئي جيڪا رسول ميمڻ صاحب زير بحث آندي آهي. ته انسان بنيادي طور موروثي چريو آهي. ايرڪ فراهر انهيءَ ڳالهه کي هيئن چئي ٿو. ته ”مون کي حيرت انهيءَ ڳالهه جي ناهي ته ماڻهو چريا ڇو ٿا ٿين، بلڪ حيرت انهيءَ ڳالهه جي آهي ته ماڻهو چريا ڇو نٿا ٿين؟“ اصل ۾ هن فطرت عالم ۾ ڪائنات ڪو مانڊاڻ آهي. ڪو اسرار آهي، جادو آهي، تصور آهي يا وهر آهي پر ڪا به خبر ناهي. نه جوهر آهي، نه مابعد الطبياتي سوالن جا جواب آهن. اٽو ماڻهو وڪريل فطرت آهي. بلڪ فطرت جي ارتقا ۾ چريائپ آهي، بگاڙ آهي. پر ماڻهو پاڻ کي ڪيئن قابو ڪري ٿو. بلڪ ائين چئجي ته چريو ئي حقيقي فطرت ۾ جيئي ٿو. پر سالر ماڻهو فطرت جو بگاڙ آهي. مان سمجهان ٿو رسول ميمڻ جو اهو سوال پر اثر آهي پر آخر ڪهڙي قوت اسان کي سالر رکي ٿي؟ اها قوت رومانويت جي قوت آهي. جيڪا انسان ۽ فطرت کي هڪ ٻئي سان جوڙي ٿي. مان پنهنجي ڪتاب ”نفسياتي اصطلاحن جي آئيني برسندي سماج“ ۾ انهيءَ تي گهڻو بحث ڪري چڪو آهيان.

پر هڪ ٻي وجودي فلسفي جو موقف به آهي ته انسان ڪنهن نه ڪنهن چپر چانو جو سهارو وٺي ٿو. تنهن ڪري سالر رهي ٿو. مثال طور خدا جو سهارو، مذهب جو سهارو، نظريي يا سياسي پارٽي جو سهارو، يا خاندان جو سهارو. محبت جو سهارو. مطلب ته اهو سهارو جنهن ۾ پاڻ جا هٿيار ڦٽا ڪرڻا پون. بلڪ جبر کي خوشي خوشي برداشت ڪجي يعني غلامي ۾ به وڏي آفيت آهي. نه ته آزادي جو مڪمل اختيار برداشت ڪرڻ ڏکيو آهي بلڪ هڪ وڏي دهشت جو سامهون ڪرڻ آهي. انسان کي سبب



۽ اثر جي بيماري لڳل آهي. هو هر عمل يا واقعي جو سبب ڄاڻي مطمعين ٿي ويندو آهي. اهو سبب ئي فطرت جو جبر آهي. ڪلاسيڪل فزڪس ۾ هر عمل فارمولائيز آهي. پر ڪوانٽم فزڪس ان جي ابتڙ آهي. بنيادي طور شعور وڌو مسئلو آهي. رسول ميمڻ جو انهيءَ سوال کي به اپاريو آهي ته ”انسان جنت ۾ جانور بنجي رهي سگهي ٿو.“

چو ته انسان becoming آهي ڪٿي به رڪجي ٿو. تنهن ڪري سڪون مادي وجود ۾ آهي ئي ڪونه. زندگي جا سڀ ناٽڪ وجود جي دهشت کان بچڻ لاءِ آهن انهيءَ ڪري جنت ۾ صرف نيسي ۾ رهي سگهجي ٿو. تنهن ڪري سچ کي ڳولڻ جو سوال ائين آهي ”جيئن ڪا ماءُ پنهنجي ويڃايل ٻار کي ڳوليندي هجي جيڪو کيس ڄاڻو ئي ڪونهي. شعور اهو ٿانڌو آهي جيڪو دماغ جي چلڻ ۾ پري ٿو.“ جڏهن ڪو مذهبي ماڻهو چوي ٿو ته مادي جي پٺيان ڪجهه آهي. ڪجهه ته آهي جيڪو هن ڪائنات جي پٺيان آهي. ته دراصل اهو ڪفر پيو ڪري چو ته جيڪو ڪجهه آهي جيڪڏهن اهو اسان جي ادراڪ ۾ اچي سگهي ٿو ته اهو خدا ناهي. اهو شڪل يا خاصيت ۾ ظاهر ڪرڻ معنيٰ بت پرستي ڪرڻ آهي.

هن ڪتاب جو هڪ موضوع اڳ واقعي جون وٿيون آهن. جنهن ۾ ٻولي اندر منطقي طور جملي ۾ لفظن جون اهڙيون وٿيون آهن جيڪي ڪنهن جي هٿن جو انومان پيدا ڪن ٿيون. مثال ۾ حوا دير سان آئي جو ٽريفڪ ۾ ڦاٿل هئي. هن جملي کي جيڪڏهن هيئن لکجي ته ”دير سان آئي جو ٽريفڪ ۾ ڦاٿل هئي“ ته هن جملي ۾ حوا لفظي طور موجود ناهي. پر جملي ۾ وٿي آهي جيڪا ڪنهن جي هٿن جي خبر ڏي ٿي ڪير آهي اهو لڪل آهي.

مثال: تون ڏاڍو پاڳ وارو آهين.

جملي اندر ڪيتريون معنائون لڪل آهن. مثال تون پاڳ وارو آهين ٻيا نه آهن؛ تون پاڳ وارو آهين؛ مان نه آهيان. تون پاڳ وارو آهين؛ جنهن ڪري تو ڪجهه حاصل ڪيو آهي، يا تون پاڳ وارو آهين؛ جنهن ڪري مصيبت کان بچي وئين. مطلب جملي جي اندر معنائن جا پندار ظاهر ٿي پوندا. جيڪي لڪل آهن. تنهن ڪري ان لڪل شيء جي معنيٰ سنسار ۾ موجود آهي. يا وري هيئن به چئي سگهجي ٿو جملي سان گڏ ڪيتريون لڪل ڳالهيون موجود آهن. سنسار به جيڪي ڪجهه ظاهر ڪري ٿو ان کان وڌيڪ لڪائي ٿو. جنهن کي ظاهر ڪرڻ ٻوليءَ جي وس ۾ ناهي. رسول ميمڻ اهڙن مابعد الطبيات جي موضوعن کي چهي اسان کي

بحث جو پاسو ڏيکاري ٿو جيڪو فلسفي جي جان آهي. عام طرح انهيءَ انداز سان سوچڻ جو رخ اسان وٽ قابل قبول ناهي. چوٽ سنڌ ۾ مارڪس وادي سوچ کي آخري سوچ سمجهي فيصلو صادر ڪيو ويو آهي. پر اسان کي هن سوچ لاءِ سائنس جي مدد وٺڻي پوندي. سائنس مادي جي خاصيتن جو علم آهي. ڪائنات جي وسعت ۾ اسان زمان و مڪان ۾ قيد آهيون. اسان جو علم هڪ حد تائين اسان جو ساٿ ڏيئي ٿو. پر جلدي هڪ حيراني پيدا ڪري ٿو. تنهن ڪري برٽرينڊ رسل واري ڳالهه انتهائي اهم آهي ته ”علم جي شروعات حيراني کان ٿئي ٿي، وري علم جي انتها به حيراني تي ٿئي ٿي، پهرين حيراني جهالت واري آهي ٻي حيراني عرفانيت واري آهي.“ عرفان جي ان منزل تي پهچي وجدان ٿئي ٿو ته اسان جنهن تانڊائي کي حقيقت سمجهي جهليو پي اهو جڳهه بدلائي چڪو آهي.

مان سمجهان ٿو ته ڊاڪٽر رسول ميمڻ جي هن ڪتاب کي ۽ ڊاڪٽر سڪندر مغل جو ڪتاب ”رنگي رنگ بنايا“ کي گڏي پڙهڻ گهرجي. هڪ فلسفو ٻيو سائنس جو ڪتاب آهي ٻئي عرفاني حيراني جي منزل تي پهچائڻ ٿا.

## ملائيشيا جي موسم - نانگ بلائون - حسابن ۾ ڪڍي آهيان

سنڌ جي جهوني اديب محترم محمد اسماعيل عرساڻي ٿر بابت پنهنجي هڪ ڪتاب ”بدنصيب ٿري“ ۾ لکيو آهي ته هڪ ٿري شاگرد کان جڏهن پڇيڻ ته سال ۾ مندو گهڻيون آهن ته وراثيائين: ”پنج- اونهارو، سر، سيارو، بهار ۽ وسڪارو.“ ان بعد عرساڻي صاحب ٿر ۾ مينهن جي اهميت بابت لکيو آهي ته ٿري ماڻهو، جي زندگي جو مدار مينهن جي ڦڙين تي آهي. مينهن وسڻ سان ٿر، ٿر آهي نه ته جهڙو بر، ان ڪري ٿرين لاءِ پنجين ۽ سڀ ۾ اهر موسم وسڪارو آهي.

شايد اهو ئي سبب آهي جو ڪو به ٿري ڪٿي ڪراچي، جي ڪاسمو پولين شهر ۾ هجي يا اسلام آباد ۾ آرام جي نوڪري ڪري رهيو هجي، پر کنوڻ جي پهرين ڪڇڪي تي ئي ڪوشش ڪندو ته ٿر پڇجي. ٿر ۾ ته پنج مندو آهن. پر هتي ملائيشيا ۾ ڪيتريون ئي سگهن ٿيون؟! جواب آهي: فقط هڪ! هتي ملائيشيا ۾ نه سيارو ٿئي ۽ نه اونهارو. نه بهار ۽ نه وري سر،! ٻارهوئي جهڙ ۽ مينهن پوي.

ڌرتيءَ تي سيارو تڏهن ٿئي ٿو جڏهن ڌرتيءَ جو مٿيون اڌ گول سج کان ڪجهه مهينن لاءِ پاسيرو ٿيو وڃي. ۽ جڏهن ان اڌ گولي ۾ سيارو هوندو آهي ته باقي اڌ تي اونهارو هوندو آهي. ڇاڪاڻ جو اڌ گولي جو سج ڏي منهن هڃڻ ڪري اتي تپش ٿئي ۽ ساڳي وقت سج جي روشني گهڻي دير رهڻ ڪري اوندھ ٿئي ۽ اسان چوندا آهيون ته راتيون وڏيون ٿي ويون آهن. پر ملائيشيا جو ملڪ خط استوا- يعني دنيا جي وچ مان لڳهندڙ خيالي ليڪ جي ايترو ته ويجهو آهي جو سڄو سال سج هڪجهڙو ئي رهي ٿو ۽ نه فقط موسم سڄو سال هڪ جهڙي رهي ٿي، پر ڏينهن رات به هڪ جيئو ٿئي ٿو. سڄي سال ۾ چند متن جو ڪو فرق ٿئي ٿو. باقي هتي مينهن ٻارهوئي وسندو رهي ٿو. سو جيڪڏهن ملائيشيا ۾ ڪا مند آهي به ته فقط مينهونگي- جيڪا سڄو سال هلي ٿي.

ايڏي مينهن جو ٻڌي ٻئي ڪنهن کي تعجب لڳي يا نه، پر عربن، مصرين، سنڌين، راجستانين، آمريڪا جي رياست ٽيڪساس جي رهاڪن، ڏکڻ لڊيا ۽ سوڊان جي رهاڪن ۽ ٻين اهڙن کي ضرور ٿيندو هوندو، جيڪي دنيا جو ٿر، صحرا ۽ گوبي جهڙن بيابانن، برپتن ۽ رڻ پتن جا رهاڪو آهن.

هتي ملائيشيا ۾ جهڙ ته روز هوندو آهي. سڄي ڏينهن ۾ شايد ڪا اهڙي گهڙي هجي جنهن ۾ آسمان ڪڪرن کان خالي هجي باقي وقت ڪجهه نه ڪجهه ڪڪر ضرور هوندا آهن، مينهن وچ ۾ ڏينهن ۾ ساڄي پٽي وري هفتو ڏيڍ پيو وسندو. پوءِ ڪڏهن لڳاتار ته ڪڏهن رڪي رڪي وڌ ڦڙو ۽ بوندا باندي. جيئن گذريل سال ڪرسمس جي ڏينهن تي سڄي سنگاپور ۽ ملائيشيا جي جوهور رياست ۾ لڳاتار ٻاهتر ڪلاڪ مينهن وسندو رهيو.

مينهن جي ڪري هتي چوڌاري ساوڪ ٿي ساوڪ رهي ٿي. بقول آصف جي اسان وٽ گاهه پوکڻ به وڏي ڳالهه آهي، جنهن لاءِ زمين ٺاهڻي پوندي، پاڻ وجهڻو پوندو ۽ پاڻي جو بندوبست ڪرڻو پوندو. جيڪو پاڻي انسانن کي به پيئڻ لاءِ پورو ناهي. پر هتي ملائيشيا ۾ ماڻهن کي وڻ ٽڻ يا گل ٻوٽا پوکڻ لاءِ ڪا به تڪليف نٿي ڪرڻي پوي. هر شيءِ جلد ڦٽي ٿي ۽ ماڻهن کي رڳو وڌيڪ وڻن يا گاهه کي چانگڻ ۽ ڪٽڻ جو سوچڻو پوي ٿو.

اسان وٽ ندين ۾ پاڻي هماليه جبل تان برف ڳرڻ بعد موسم آهر ٿورو يا گهڻو جيڪو اچي ٿو ان کي واهن ۽ شاخن رستي ورهائي ٻنين ٻارن کي ڏنو وڃي ٿو. درياھ نديون ملائيشيا ۾ به آهن، پر اهي پوک طور نٿيون ڪم ۾ اچن. پر نارن ڪسين طور، هتي جون نديون نالا ٻين ٻارن ۽ شهرن جو پاڻي کڻي سمنڊ ڏي وڃن. يعني هتي جي ٻنين ٻارن/پوک کي ندين جي پاڻي جي ضرورت ناهي، مينهن جو پاڻي ئي ايترو ٿو ٿئي جو ٻوڙ ٻوڙان لڳيو وڃي ۽ فالتو پاڻي وهي ننديون ناليون، پوءِ واه ۽ پوءِ وڏا درياھ ٺاهيو وڃيو سمنڊ ۾ ڇوڙ ڪري. ائين جي سلسلو نه هجي ته مينهن جو پاڻي بيٺل فصل ۽ گهر گهاٽ ٻوڙي رکي. يعني هتي اسان وارو حساب ناهي ته سياري ۾ برف نه ڳرڻ ڪري يڪا به ٿي مهينا درياھ سڪل هوندو ۽ اونهاري ۾ وري به ٿي مهينا ٻوڙ ٻوڙان. پر هتي جي دريائن جي لاهه چاڙھ ۾ ڦيرو مهينن بدران روز اچي. يعني جنهن ڏينهن گهڻو مينهن پيو ته سڀ ننديون سمنڊ ڏي ٽپ ٿيو پيون وينديون ۽ جي مينهن جهڪو ٿيو ته يڪدم ندين جي ليول لهي وڃي پٽ پوندي آهي.

ملائيشيا ۾ ڪيتريون ئي نديون آهن، جيڪي ڪسين جون ڪم ڏين



۽ سڄي ملڪ جي مينهن جو پاڻي سمنڊ تائين پهچائين ٿيون. ڪن اهر ندين جا نالا آهن: بارام ندي، ڪيلنتائين ندي، لاپوک ندي، پاهانگ ندي، پيراڪ ندي، راجانگ ندي، سيگاما ندي، وغيره وغيره.

مينهن گهڻي پوڻ ڪري گاهه ٻوٽا وڻ ٿڌ هتي جام آهن. وڻواهه ۽ ٻيلن ڪري انيڪ جيت، پکي، نانگ بلائون ۽ جانور آهن. يورپ ۽ آمريڪا جي ٿڌن ملڪن ۾ برف گهڻي پوڻ ڪري گهڻيون ۽ رستا هلچل جي قابل نه رهندا آهن ۽ هر وقت برف هڻائي ويندي آهي، جيئن صفائي رهي، تيئن هتي ملائيشيا ۾ وري گهڻي مينهن وسڻ ڪري گپ يا مينهن جو پاڻي ته ڪو نه ٿو بيهي. پر ڏسندي ئي ڏسندي گاهه ايڏو ته جلد وڌيو وڃي جو ان مان هلڻ نه فقط ڏکيو پر خطرناڪ ٿيو پوي. ڇاڪاڻ جو هڪ ته صبح جي وقت ماڪ پوڻ ڪري آلو ٿو رهي ۽ ڪپڙا (پتلون، شلوار يا گوڏ) خراب ٿيو پوي ۽ رات جي وقت وري ان ۾ زهريلا جيت جڻيا. خاص ڪري نانگ بلائن جو خطرو رهي ٿو ۽ ڪيترائي انهن جي ڏنگن/چڪن جو شڪار ٿين ٿا.

هونءَ ڏکڻ اوڀر ايشيا جي ملڪن ۾ جانورن ۽ جيتن جڻين ۾ سڀ کان خطرناڪ زهريلا نانگ بلائون آهن. دنيا جي ٻئي ڪنهن به علائقي ۾ ايترا ماڻهو نٿا ڏنگجن، جيترا ڏکڻ اوڀر ايشيا جي ملڪن: ٿائيلينڊ، ملائيشيا، انڊونيشيا، فلپين، ڪمپوچيا، برما وغيره ۾. ڊاڪٽري رپورٽن موجب رڳو ملائيشيا ۾ هر سال ڇهه هزار ماڻهو نانگن جي چڪن ڪري اسپتالن ۾ اچن ٿا. (ياد رهي ته سڄي ملائيشيا ۾ آدمشماري ڪراچي، جيتري آهي ۽ ان حساب موجب اهو انگ تمام وڏو آهي.)

اهلڪه ميڊيڪل جي اڇت مدد ڪري ڪافي ماڻهو ڇاق چڱا پلا ٿيو وڃن. مثال طور: ڪجهه عرصو اڳ اسان جي ڏوٻي، جي ماءُ کي جيئن ئي نانگ چڪ هنيو ته هن کي يڪدم پر واري اسپتال ۾ کڻائي ويا. چڪ جي نشان مان ڊاڪٽر سمجهي ويو ته هن کي واسينگ (Cobra) نانگ چڪ هنيو آهي. ڊاڪٽر کيس يڪدم انٽي وينن Anti Venin ڏنو. اها هڪ اهڙي دوا آهي جيڪا گهوڙي کي ڇهه اٺ مهينا ٿورو ٿورو زهر کائڻ تي هيرائي پوءِ ان جي رت مان ٺاهي وڃي ٿي. جيئن ماما ۽ ارڙي، جي بچاءُ لاءِ جيڪي ٽڪا هڻبا آهن. انهن جي دوا ڊگهين مان ڪڍي ويندي آهي. نانگ جي چڪ جي علاج لاءِ نانگ جي زهر مان پڻ دوا (Serum) ٺاهي ويندي آهي.

بهرحال هن ڏوٻي، جي ماءُ کي اسپتال تائين پهچڻ کان اڳ ئي ساهه کڻڻ ۾ تڪليف شروع ٿي ويئي هئي سو ڊاڪٽر آرٿيشل-ساهر-ڪٽهيءَ

ذريعي هن کي ساه کٽائڻ شروع ڪيو. ٽن ڏينهن بعد هو، ان لائق ٿي جو پاڻهي ساه کڻي سگهي. سندس پير ۽ چنگه هڪ هفتو پيو به سڃيل رهي. اسپتال مان ڊسچارج ٿي گهر ته آئي پر ڪجهه ڏينهن بعد هن کي پير ۾ گڻگرين ٿي پيئي، جنهن لاءِ وري کيس اسپتال موٽي ويڻو پيو ۽ مهينو کن پيو به علاج هيٺ هئي. پوءِ وڃي چاق چڱي پلي ٿي. پر وري به هيءُ خوشنصيب چڻبي جو ترت علاج ٿيڻ ڪري بچي ويئي.

هونءَ ڪو به ملڪ يا علائقو نانگ بلائن کان بچيل ناهي. چاهي جهنگ جهر هجي يا بيابان رڻ پٽ، جابلو علائقو هجي يا سامونڊي. پر دنيا جي هن پاسي ڪجهه گهڻائي نانگ بلائون آهن ۽ انهن ۾ گهڻو حصو خطرناڪ ۽ زهريلن نانگن جو آهي. جيئن مثال طور واسينگ نانگ هتي تمام گهڻو آهي، جنهن کي اسان وٽ جوڳي اڪثر مرلين تي نچائي پٽا ڪمائيندا آهن. کي کي واسينگ نانگ ته ارڙهن فوٽن جا به ٿين ۽ نانگن جي ڄاڻن جو چوڻ آهي ته واسينگ نانگ سٺو کان به مٿي دفعا هڪ ئي وقت ڏنگ هڻي سگهي ٿو. واسينگ نانگ ڪرڻا ۽ ڏيڏر ڪاٺڻ جا شوقين آهن. ان ڪري اهي گهرن اڳيان ئي ڦرندا نظر اچن ٿا. پوءِ ڪنهن ماڻهو جو جيڪڏهن مٿان پير اچيو وڃي ته چڪيو رکن. واسينگن کان علاوه ٻيا به ڪيترائي زهريلو نانگ گهرن اڳيان خاص ڪري چپر ۽ گاهه تي ڦرن ٿا، جن جي بچاءُ لاءِ هتي جا ماڻهو اڪثر نصيحت ڪندا آهن ته رات جي وقت وڏو بوٽ ۽ پتلون پائي پوءِ چپر تي هلجي، خاص ڪري گرم ۽ گهميل راتين جو ته وڌيڪ خيال رکجي. پاڻ سان گڏ ٽارچ رکجي ۽ ٿي سگهي ته لڪڻ پڻ کڻي هلجي. جنهن کي پٽ تي هڻڻ جو آواز تي نانگ اڳواٽ پري پڇي ويندو. نانگن کي ڪن نه ٿين سو ٻڌي ته نه سگهندو آهي. پر زمين تي لڪڻ هڻڻ سان (يا مرليءَ جي آواز تي) جيڪي زمين يا هوا ۾ لهرو پيدا ٿين ٿيون، اهي هن جو جسر محسوس ڪري سگهي ٿو.

ڪنهن به پوري بند يا گاهه ۾ هٿ نه وجهجي. ڪو پٿر يا بند رکيو هجي ته ان تان لانگ ورائي ٽپڻ بدران ان جي مٿان پير رکجي جو ڪڏهن ڪڏهن پٿر جي پويان نانگ لڪي ويهي ٿو. ڪنهن به نانگ ۾ هٿ نه وجهجي، چاهي اهو جيئرو هجي يا مئل. پنهنجي گهر جو گاهه جيئن وڌي ته ڪتري ننڍو ڪرائي ڇڏجي، گند ڪچري جي ڍير يا پراڻي ڪوهه وٽان لنگهڻ کان پاسو ڪجي جو اهڙن هنڌن تي گهڻو ڪري نانگ ڏيڏرن جي تاڙ ۾ ويندو هوندا آهن. گهر ۾ جي ڪوئا هجن ته انهن کي مارائي ڇڏجي جو ڪوئا پڻ نانگن لاءِ وڏي ڪشش آهن. جيڪڏهن ڪو نانگ سامهون اچي وڃي ته

پريشان ٿي ان کي انڌاڏند ڏندا وهائي ڪڍجن. ڪوشش ڪري ڇپ ڇاپ  
 بيهي رهجي، ڇو جو چرپر تي نانگن جو ڌيان ڇڪجي ٿو ۽ ماڻ ڪري  
 بيهڻ سان گهڻو ڪري نانگ پاسو ڏيئي پڇي وڃي ٿو. گهڻو ڪري نانگ  
 تيسين چڪ نٿو هڻي جيسين ان سان ڪشڻ نٿي ڪجي. جيڪڏهن ڪو  
 زهريلو نانگ گهر ۾ گهڙي اچي ۽ ان کي هروڀرو مارڻو ٿي پوي ته نهايت  
 خبرداري سان لٽ جي هڪ ئي ڌڪ سان سندس منهن ڇڄري رکجي، ڇو  
 جو جيئري نانگ کان ڦٽيل نانگ خطرناڪ ٿئي ٿو. ڪڏهن به تڪي شيءَ  
 ڪهاڙي، ڪات يا ترار جي ڦر سان نانگ کي ڌڪ نه هڻجي جو ائين ڪرڻ  
 سان نانگ فقط ٻه اڌ ٿيو پوي ۽ اڌ نانگ مان به ساڳيو خطرو آهي جيڪو  
 سڄي مان.

گهڻي گاهه مان اهو سو فائدو ضرور آهي ته هتي جانور وهڻ خوش ۽  
 متارا آهن. سندن پيرن هيٺان هر وقت ۽ هر هنڌ گاهه ٿي گاهه موجود آهي.  
 ڪنهن جي گهرا ڳيان ڍڳيون مينهنون وڃي چرنديون ته گهر جو مالڪ کين  
 ڍڪ ۾ امانت بدران خوش ٿيندو ته پلي گهڻي کان گهڻو گاهه کائي وڃن.  
 جيئن ايندڙ موڪل جو ڏينهن گاهه ڪٽڻ کان فرست ملي وڃي. پاڻ وٽ  
 ڪراچي، ۽ ٻيا گهر اڳيان ڇپر پوکڻ ته ناممڪن ڳالهه آهي. پر جي ڪو پٺي ۽  
 وهنجڻ جي حصي مان پاڻي بچائي گاهه سلو پوکي ٿو. ۽ ڪا ڍڳي ان ۾  
 منهن اچيو وجهي ته پٿر نڪاڻ ٿيو وڃينس. ويچارين گاهه ته ڇا. ڪڙن  
 ڪسارن پوئڻ ۾ به پيون چڪ هڻن. کين نه وڻاڻ تي ڌاري جو وجهه نه پهر  
 تي ڏي، اڪثر سپر هاءِ وي تي اگهاڙن ٽرڪن ۾ تنهن اس ۾ اسان جي بي  
 زبان جانورن کي ائين ڏوهندو ڏسي ڏاڍو ڌڪ ٿئي ٿو. بڪ ۽ اڇ ڪري  
 سندن پيٽ پٺي سان لڳل هوندو آهي. پر هتي جي چوپايو شايد ئي ڪو  
 ڏينهن - بلڪ ڪو ڪلاڪ به بڪ ۾ کائيو هجي. ان ڪري جنهن دور ڏي  
 نظر ڪر ته متارو نظر اچي ٿو.

هتي جي حڪومت ماڻهن جي صحت جو نهايت خيال رکي ٿي. ڪنهن  
 به بيمار يا پوڙهي دور کي ڪهي گوشت وڪڻڻ تي سخت چڪاس ۽  
 سزائون آهن. ڍڳي يا مينهن جي ذبح ٿيڻ جي عمر مقرر ٿيل آهي.  
 ان عمر تي پهچڻ سان کيس ڪهي سگهجي ٿو. بلڪل ننڍي يا پوڙهي دور  
 تي کاتي ڦيرائڻ ڏوه جو ڪر آهي. اسان وٽ مجبوري ڪارڻ ننڍي عمر  
 جون ڍڳيون ڍڳا ان ڪري به ذبح نٿا ڪيا وڃن جو کائڻ ڪير ۽ هر ڪاهڻ  
 جو ڪم ورتو وڃي ٿو. جيسين هر ڪاهڻ يا کير ڏيڻ جي صلاحيت رکن ٿا،  
 تيسين کين ڪهن نقصانڪار سمجهيو وڃي ٿو. پر هتي ملائيشيا ۾ پوک



جونمونو اهڙو آهي جنهن ۾ نه گهڻي هر جي ضرورت نه ريج جي.  
 مزيدار ڳالهه اسان جي پاڙيسري همراھ مسٽر گونا راجا ٻڌائي ته هتي  
 جا ملٽي مسلمان مينهن يا ڊگي، جو کير پيئن ئي ڪو نه جو هنن کي تازي  
 کير جي پوءِ پسند ناهي. ڇانهه ۾ به ڊپن جو مٺو Condensed کير وجهن. ٻئي  
 نمبر تي هتي جي آدمشماري چيني ماڻهن جي آهي. اهي پڻ کير کي هٿ نه  
 لائين. چيومانس. ”حق تي اسان جو کير واري روز پچندي آهي ته پيا  
 پاڪستاني ڪڏهن ايندا؟ کير وڪڻڻ لاءِ هڪ تامل هندو چوڪري Jeans جي  
 پتلون ۽ جئڪٽ پائي ايندي آهي.

گونا کلي چيو: ها، هتي ڪو به کير ڪو نه پيئي. آئون هتي آيس ته  
 پهرين پهرين مون هن کي کير لاءِ چيو جو اسين انڊين ته کير پيئون. پوءِ  
 ڪئپٽن مخدوم ۽ ڪئپٽن ننڍڪر چيو. پوءِ آصف ۽ توهان. سو ظاهر آهي ته  
 سندس کير جيڪو ضايع ٿي ويندو هو تنهن جا هاڻ پئسا پيا ملندس.  
 مخدوم جڏهن آيو ۽ مينهن يا ڊگي جي تازي کير لاءِ پڇيائين ته مون کي  
 ڏاڍو تعجب لڳو. مون چيومانس ته يار تون مسلمان آهين. هتي جا ملٽي  
 مسلمان ته ڊگي، جو کير پيئن ئي ڪو نه. کير رڳو اهي هندو ۽ ڪرسچن ٿا  
 پيئن جيڪي اصل هندستان يا يورپ کان لڏي هتي آيل آهن. ته مخدوم  
 ورائيو: ”ڊگي، جو ته ڇا مينهن جو کير ملي ته اڃا به بهتر. اسان وٽ  
 پاڪستان ۾ ته کير پيئڻ جي عادت ننڍي هوندي کان وجهن ۽ کير جي  
 ڪپٽ ايتري ته آهي جو کير وارا پورٽ ۽ پئسو ڪمائڻ لاءِ کير ۾ پاڻي به  
 ملائي وڪڻن.“

گونا کان پڇير: ”پنهجي کير واري چوڪري، کي گهڻيون ڊگيون  
 آهن؟“

چيائين: ”فقط هڪڙي.“

آصف کي چير ته استاد وڌيڪ کير جي ضرورت پيئي ته هاڻ ڪنهن  
 ٻئي کي کير آڻڻ لاءِ چئبو. نه ته کير پورو ڪرڻ لاءِ هي، به اهو ئي ڪم  
 ڪندي جيڪو سندس پائر پينرون اڄڪلهه سنڌ، پنجاب، بلوچستان کان  
 گجرات مهاراشٽرا، اتر پرديش ۽ بنگال ۾ ڪري رهيا آهن. يعني کير ۾  
 پاڻي ملائيندي. اڃا به جي ضروري سمجهيائين ته پاڻي، ۾ کير ملائيندي.  
 آصف کلي چيو: ”نه يار، ائين هتي هرگز نه ٿيندو. ان بابت پڪ ڪري  
 چڪو آهيان، ڪانس پڇيو هوم ته ”وڌيڪ کير جي ضرورت پيئي ته پوءِ  
 تنهنجي هڪڙي ڊگي ته پوري پئجي نه سگهندي.“ ورائيو هئائين: ”منهنجي  
 ڊگي ته هينئر به کير ڪا نه ٿي ڏئي.....“



آصف جي ڳالهه اڌ ۾ ڪٽي وائڙو ٿي پڇيومانس: ”ته پوءِ نيندو، انڪري  
 يار ريڊ ڪائو جو پائوڊر پاڻي، ۾ ملائي ٿي ڏئي ڇا؟“  
 ”نه نه، منهنجي ڳالهه ٻڌ. هن ٻڌايو ته رستي تي يا پاڙي اوڙي ۾ کيس  
 جيڪا به ڊگهي نظر اچي ٿي ته ان جو کير ڏهي اچي وڪڻندي آهي، جو هتي  
 ته کير جي ڪنهن کي ضرورت ئي ڪانهي. ۽ پشما به ڪو کير جي حساب  
 سان ڪو نه ٿي ڏئي، پر سمجهه ته سندس ڏهاڻي، جي محنت ۽  
 موٽرسائيڪل جي پيٽرول جا آهن، جنهن تي هو، چڙهيو ٿي اچي. تڏهن ته  
 چيائين پئي ته جي ٻيا به گهڻا اچي ويا ته پوءِ قرض ڏجو ته کير ڏهن واري  
 اليڪٽرڪ مشين وٺان.“

تنهن تي گونا خبردار ڪندي چيو: ”متان پشما اڳواٽ ڏنا اٿائون. ليکي  
 چوڪي ۾ هون، ٿي صحيح ناهي. روز جيڪو کير ڏئي اهو لکندا به وڃو.  
 جو مهيني ۾ ٻه چار ڏينهن کير آئي ڪا نه ٿي، پر مهيني پوري ٿيڻ تي  
 پشما سڄي مهيني جا ٿي وئي. اڳئين مهيني جا سورهن ڊالر (جهانوي رپيا)  
 وٺڻ آئي ته پڇيومانس سورنهن ڊالر ڪيئن ٿيا. ته چوڻ لڳي: روز هڪ سير  
 کير جا پنجاهه سينٽ ٿيا ۽ اوڻٽيهن ڏينهن جا ٿيا سورهن ڊالر. تنهن تي  
 چيومانس ته پهرين ڳالهه ته پنجاهه کي اوڻٽيهن سان ضرب ڪرڻ سان  
 سورهن ڊالر نه پر ساڍا چوڏهن ڊالر ٿا ٿين ۽ ٻي ڳالهه ته تون هن مهيني  
 فقط پنجويهه ڏينهن آئي هئين. جيڪو آئون روز ڪئلينڊر تي نوٽ ڪندو  
 وڃان، سو ان حساب سان فقط ساڍا ٻارهن ڊالر ٿيا. تنهن تي کلي  
 ورائيائين: آئون حساب ۾ ڪچي آهيان. اسڪول ۾ به فيل ٿيندي هيس.  
 تنهن تي چيومانس ته اهو پلي ٿيندي هئين، پر ايتري ڪا ڪچي نه آهيان  
 جو ڪنهن مهيني حساب ڪڍي گهٽ وٺين؟“

## سنڌو سڀيتا ۽ عمان (ماگان) وچ ۾ واپاري لاڳاپا

دنيا جي ٽن قديم تهذيبن سنڌو، مصر ۽ عراق (سميرين) وچ ۾ 5 هزار سال اڳ واپاري لاڳاپا موجود هيا. عراقي تهذيب جي قديم آثارن مان مليل سميري لکتن ۾ ان دور جي ٽن پرڏيهي واپاري مرڪزن ماگان، دلمون ۽ ميلوها جو ذڪر ملي ٿو. جتان جا واپاري عراق ۾ مختلف شين جي واپار سانگي ايندا هيا يا واپاري ڪالونيون قائم ڪري رهائش پذير هئا. جديد کوجنائن ذريعي ماهر ان ڳالهه تي سهمت آهن ته ميلوها واري سنڌو ماڻھو جي تهذيب سان واسطو رکندڙ واپاري هيا. (1) (2) جڏهن ته دلمون جا واپاري موجوده بحرین سان لاڳاپو رکندڙ هيا. (3) (4) سميري لکتن ۾ جنهن ماگان نالي ديس جو ذڪر ڪيو ويو آهي، اهو علائقو موجوده عمان ۽ گڏيل عرب امارتن تي مشتمل هو. سميرين لکتن ۾ ماگان ديس جو پهريون ڀيرو ذڪر ان دور ۾ ڪيل آهي، جڏهن موجوده عمان ۽ گڏيل عرب امارتن ۾ قديم تهذيب ام لار (2600-2000 ق م) وجود رکندڙ هئي. سميري لکتن ۾ ماگان کي جهاز سازي ۽ سامونڊي صلاحيتن سبب شهرت مليل هئي. سميرين بادشاهه سارگون (2371-2316 ق م) اها ڳالهه فخر سان چوندي نظر اچي ٿو ته سندس ديس جي بندرگاهن تي دلمون، ماگان ۽ ميلوها کان ٻيڙا اچن ٿا. سميرين بادشاهه سارگون کان پوءِ سندس جاءِ والاريندڙ بادشاهه نارام-سن (Naram-Sin) ماگان تي قبضو ڪري ورتو. ان دور ۾ سميرين ۽ سنڌو سڀيتا وچ ۾ ماگان جي ذريعي واپار ٿيندو هو. (5) آرڪيالاجي ماهرن موجب سنڌو ماڻھو جي سڀيتا جي وارثن جو عمان سميت ٻين عرب ملڪن سان واپار ايراني نار رستي ٿيندو هو. (6) (7)

قديم آثارن جي ماهر ڊيني فرينز موجب اومان مان آرڪيالاجسٽن قديم ماڳن جي کوٽاين دوران سنڌو ماڻھو سان واسطو رکندڙ سامان رکڻ جا وڏا ڪولا، پينٽ ٿيل برتن ۽ عقيق جا مڻيا هٿ ڪيا آهن. اتان سنڌو

ماڻھو مان آندل ھاڻي جي ڏندن مان ٺھيل شيون ۽ ذات جا اوزار به ھٿ ڪيا ويا آھن. عمان جي ماڳن تان سنڌو جون مھرون ۽ تور ڪرڻ جا چوڪنڊا وٽ به دريافت ڪيا ويا آھن. عمان جي قديم آثارن مان سنڌو ماڻھو جي وارثن طرفان آندل برتنن ۾ کاڌي خوراڪ کي ڪنھن خاص تقريب ۾ پيش ڪرڻ لاءِ پيڊسٽل ڊشون خاص ڌيان جو مرڪز آھن. (8) انھن ڊشون کي خوبصورت بناڻ لاءِ مٿن رنگن ذريعي گلڪاري ٿيل آھي.

مسقط جي ريسرچ سينٽر ۾ تازو ٿيل ھڪ تحقيق ذريعي سنڌو ماڻھو جي سڀيتا ۽ قديم عمان (ماڳان) جي رھواسين وچ ۾ لاڳاپن بابت وڌيڪ ثبوت مليا آھن. (9) عمان جي شھر صحار ڀرسان ڪنجھي جي دور جو ھڪ قديم ماڳ دھوا (Dahwa) دريافت ڪيو ويو آھي. جتان سنڌو تھذيب سان واسطو رکندڙ ھڪ مھر ۽ گاڙھي ۽ ڪاري رنگ جي چٽسالي وارن ٿانون جي باقيات ملي آھي. جرمن يونيورسٽي جي ريڪٽر پروفيسر ڊاڪٽر مائڪل جانسين ماڳان ۽ سنڌو ماڻھو جي ماڻھن وچ ۾ لاڳاپن بابت انھن ثبوتن کي انتهائي اھم قرار ڏنو آھي. سلطان قابوس يونيورسٽي جي ميڊيا سيل جي ترجمان ڊسمبر 2017ع ۾ اھو اعلان ڪيو ھو تہ عمان جا پاڪستان جي صوبي سنڌ سان تھذيبي ۽ ثقافتي لاڳاپا ثابت ٿي چڪا آھن. (10)

قديم ماڳ دھوا ڪنجھي دور جي ام النار تھذيب (Umm Al Nar Civilization) سان واسطو رکندڙ ھيو. ام النار تھذيب 2500 کان 2000 ق م جي دور جي آھي. جيڪا موجوده سلطنت عمان ۽ گڏيل عرب امارتن تائين ڦھلاءُ رکندڙ ھئي. دھوا الباطنت ميدان جي اتر ۾ دريافت ٿيل سڀ کان قديم آبادي آھي، جنھن جا سنڌو سڀيتا سان واپاري لاڳاپا قائم ھيا. ام النار جي قديم ماڳ دھوا جي 2013ع کان 2017ع تائين کوٽائي ڪئي وئي. ھن قديم ماڳ جي کوٽائي اٽلي جي يونيورسٽي آف بولوگنا ۽ آمريڪا جي يونيورسٽي آف وسڪونسن سان واسطو رکندڙ ماھرن جي گڏيل ٽيم طرفان ڪئي وئي. ھن ماڳ تان مليل ٺڪر جا برتن ۽ خاص ڪري رڌڻ پڇاڻڻ جو سڌو سامان، اناج ۽ اٽو رکڻ جا وڏا ڪولا، مٽڪا ۽ گندڙا سنڌو ماڻھو جي مرڪزي علائقي سنڌ مان مليل نوادرات سان تعلق رکن ٿا. قديم آثارن جي ماھرن کي ھن ماڳ تان سنڌو سڀيتا جي واپارين طرفان آندل ماني پڇاڻڻ وارا پٿر جا چلھيا (اسٽو)، ھار سينگار ۾ استعمال ٿيندڙ مٽيا، ٺڪر ۾ پائڻ واريون نئون ۽ ٻيا زيور به مليا آھن. سلطان قابوس يونيورسٽي جي بيان موجب دھوا مان مليل اھو سامان سنڌ ۽ خاص ڪري موھن جي دڙي واري ريجن ۾ تيار ڪري واپار لاءِ ھتي آندو ويندو ھو.



دهوا ۾ ڪوٽائي ڪندڙ قديم آثارن جي ماهرن موجب سنڌو ماڻھو مان اهو سامان ننڍين پيڙين ذريعي سنڌو درياھ رستي سنڌ جي سامونڊي ڪناري تائين پهچايو ويو، جيڪو بعد ۾ وڏن پيڙن ذريعي شام ولایت جي سامونڊي بندر گاهه تي آندو ويو. جتان حجر جبل واري واٽ وٺي 24 ڪلوميٽر جي فاصلي تي موجود دهوا واري علائقي ۾ آندو ويو. ماهرن موجب اڃا سوڌو اها خبر پئجي نه سگهي آهي ته انهن وڏن مٽڪن ۽ ڪولن ۾ ڪهڙو سامان پري دهوا آندو ويو هوندو. ماهرن موجب امر النار ثقافت واري دور ۾ عمان سنڌ، عراق ۽ ايران ڏانهن ٽامون ايڪسپورت ڪرڻ طور مشهور هيو. (11) (12)

آمريڪا جي لائبرري آف ڪانگريس واشنگٽن ڊي سي ۾ 24 اپريل 2018ع تي عمان جي قديم تهذيب ۽ ثقافت جي حوالي سان سلطان قابوس ڪلچرل سينٽر جي سهڪار سان هڪ سمپوزيم ڪوٺايو ويو. جنهن ۾ آرڪيالاجي جي ماهرن سنڌو سڀيتا ۽ عمان جي قديم تهذيب وچ ۾ لاڳاپن تي تفصيلي روشني وڌي. آمريڪا جي ٽيمپل يونيورسٽي جي اينٿروپلاجي شعبي جي ايسوسيئيٽ پروفيسر مس ڪمبرلي ڊي وليمر ان تقريب ۾ ڳالهائيندي چيو ته سنڌو سڀيتا ۽ ماڳان جي ماڻهن وچ ۾ 2700 کان 2000 ق م وچ ۾ علائقائي سطح تي لاڳاپن جا پڪا پختا ثبوت موجود آهن. سندس موجب ٻنهي تهذيبن وچ ۾ ٽامون واپار جو مکيه ايترو هيو. دهوا جي قديم آثارن مان سنڌو ماڻھو جي سڀيتا جي وارثن جا جوڙيل ٿانون مليا آهن. جڏهن ته نيويارڪ يونيورسٽي جي اينٿروپلاجي ڊپارٽمينٽ جي محقق مس ايلي ڊولارهايڊ به پنهنجو تحقيقي مقالو پيش ڪندي اهو نتيجو ڪڍيو آهي ته 3 هزار ق م ۾ سمرين، قديم ايران، سنڌو سڀيتا ۽ ڏکڻ اوڀر عرب علائقي ۾ اهم واپاري لاڳاپا قائم هيا. ساڳي طرح وسڪونسن ميڊيسن يونيورسٽي جي اينٿروپلاجي جي پروفيسر ۽ نامياري محقق مارڪ ڪينواثر به قديم عمان جي ٽيڪنالاجي ۽ واپار جي باري ۾ اهو نتيجو ڪڍيو آهي ته اتان نڪرڻ جي برتنن جا مختلف قسم، پٿر جون مورتون، پٿر جا برتن ۽ ٽامي جو سامان وڏي مقدار ۾ مليو آهي. جنهن سان ان خطي جي ٻين علائقن سان واپاري لاڳاپن جي نشاندهي ٿئي ٿي. (13) (14)

عمان ۾ دهوا کان پوءِ ٻيو قديم ماڳ ولایت عبري (Ibri) جي الخمر ۽ الايان جي علائقي بيت ۾ 3000 ق م جي دور جا ڪجهه مقبرا آهن. جتان ان دور جي ماڻهن جون قبرون مليون آهن. هڪ شخص جي قبر مان لوھ ۽ سڱيل مان ٺهيل تلوار ۽ خنجر مليو آهي. جديد تحقيق ذريعي اهو ثابت ٿي



چڪو آهي ته ان دور ۾ اسٽيل ۽ لوھ جو استعمال سنڌو ماڻھو ۾ ٿيندو هو. عمان جي آرڪيالاجي ۽ ثقافت واري ڊائريڪٽر سلطان بينسيف ال باڪري ٽائيمز آف عمان سان ڳالهائيندي چيو آهي ته هنن قديم ماڳن تان مليل نوادرات ثابت ڪيو آهي ته ان دور ۾ عمان جي ثقافت تي سنڌو ماڻھو جي سڀيتا جو اثر موجود هو. (15) ان قبر جي دلچسپ ڳالھ اها آهي ته مڙھ جي ڀرسان مادي ۽ نر اٺ به زبح ڪري پوريل آهن. جيڪي سندس موت بعد ڪنهن رسر طور زبح ڪري سائس گڏ پوريا ويا هئا. (16) (17)

عمان جي سامونڊي ڪناري واري ماڳ راس الحد (Ras Al-Hadd) مان به سنڌو سڀيتا جا کاڌي خوراڪ رڌڻ جا برتن مليا آهن. ساڳي قسري جا برتن عمان جي ٻين ميداني علائقن جي ٻن قديم ماڳن سلوت (Salut) ۽ بات (Bat) مان به دريافت ڪيا ويا آهن. جنهن مان ثابت ٿئي ٿو ته سنڌو سڀيتا جي وارث نه فقط عمان جي سامونڊي شهرن سان واپار ڪندا هئا، پر هو ملڪ جي اندرين علائقن ۾ به پنهنجو سامان موڪليندا هئا. (18)

راس الجنز (Ras Al-Jinz) جي ماڳ تان سنڌو سڀيتا جي هڪ چورس نما مهر ملي آهي. جنهن تي مشهور هڪ سڳي ڍڳي سميت سنڌو لکت جا ڪجهه نمونا اڪريل آهن. (19) عمان جي ميداني علائقي ۾ هڪ ٻئي ماڳ بسياه (Bisyah) جي هڪ قبر مان سنڌو سڀيتا جي هڪ ننڍڙي مهر ملي آهي. جنهن تي هڪ وڏن سنگن واري ڍڳي جي مورت اڪريل آهي.

عمان جي قديم ماڳن ۽ قبرستانن مان مليل سنڌو جي باقيات ۾ عقيق جي مٿين مان جوڙيل زيور وڏي اهميت لائق آهن، عمان جا قديم رهواسي سنڌو ماڻھو مان آيل زيور وڏي شوق سان پهريندا هئا مرڻ بعد سندن مڙھن سان گڏ اهي زيور به پوريا ويندا هئا. بات (Bat) ۽ آدم (Adam) جي قديم قبرستانن جي کوٽاين دوران اهي زيور هٿ آيا آهن.

سنڌو ماڻھو ۾ هاڻي جي ڏندن مان مختلف قسري جا خوبصورت زيور، راند (جوا) ڪيڏڻ جو سامان ۽ ٻيو آرائشي شيون ٺاهيون وينديون هيون. عمان جي قديم ماڳن مان به هاڻي جي ڏندن مان ٺاهيل آرائشي زيور ۽ راند جو سامان هٿ آيو آهي، جيڪو سنڌو ماڻھو جي واپاري هٿان ڪشي وڃي اتي وڪرو ڪندا هئا. ان سان گڏ ٻارن جا رانديڪا به سنڌو ماڻھو مان عمان موڪليا ويندا هئا. جن ۾ پڪل مٽي مان ٺهيل پڪين جون مورتون ذڪر لائق آهن.

عمان ۾ سنڌو جا واپاري سامان تورڻ لاءِ مختلف سائيزن ۽ وزن جي حساب سان وٽ ۽ تاراڙيون به استعمال ڪندا هئا. سنڌو ماڻھو جي سڀيتا

جي واپارين جا اهي تور ڪرڻ وارا وٽ تل ابرق (Tell Abraq) ۽ شمل (Shimal) جي قبرن مان دريافت ڪيا ويا آهن.

اڳاٽي عمان (ماگان) ۽ سنڌو سڀيتا جي وارثن وچ ۾ واپاري لاڳاپن جا ثبوت ملڻ ان ڳالهه جي شاهدي آهي ته سنڌو سڀيتا جي اوج واري دور ۾ هن خطي جا رهواسي نه فقط پنهنجي علائقي اندر واپار ڪندا هيا، پر هنن ۾ وارن ملڪن سان به واپار ڪرڻ شروع ڪيو. هتان جا واپاري سمنڊ رستي دنيا جي مختلف خطن تائين وڃي پهتا ۽ اتان جي مارڪيٽن ۾ پنهنجون تيار ڪيل شيون وڪرو ڪيون. موهن جو دڙو، هڙاپا، چانهون جو دڙو، ڪوٽڏيجي، لوٽل، ڪالي بنگن، راڪي ڳڙهي ۽ ٻين شهري مرڪزن ۾ تيار ٿيندڙ زيور، مهرون، برتن، عقيق جي مڻين مان تيار ٿيل هار ۽ ٻيو سامان ٻيڙين ۽ غورابن ذريعي ۾ وارن تهذيبي مرڪزن تائين رسايو. جن ۾ عراق، مصر، بحرين ۽ عمان شامل هيا. سنڌو سڀيتا جي واپارين نه فقط انهن ۾ وارن عرب ملڪن ۽ مصر ۾ واپار ذريعي پنهنجي سامان وڪرو ڪيو، پر اتي واپاري ڪوٺيون قائم ڪري رهائش به اختيار ڪئي.

#### References:

- McIntosh, Jane (2008). The Ancient Indus Valley: New Perspectives. p. 46.
- Parpola, Asko; Parpola, Simo (1975), "On the relationship of the Sumerian toponym Meluhha and Sanskrit mleccha", *Studia Orientalia*, 46: 205–238
- Jesper Eidema, Flemming Højlundb (1993). "Trade or diplomacy? Assyria and Dilmun in the eighteenth century BC". *World Archaeology*. 24 (3): 441–448.
- <https://www.bbc.com/news/science-environment-22596270>
- Donald. Hawley (1970). The Trucial States. London: Allen & Unwin. p. 27.
- <https://iranicaonline.org/articles/maritime-trade-i-pre-islamic-period>
- Kenoyer, Jonathan Mark. The Indus Valley Tradition of Pakistan and western India, *Journal of World Prehistory*, volume 5, pages331–385 (1991)
- Frenez, Dennys. The Indus Civilization Trade with the Oman Peninsula, In the Shadow of the Ancestors. The Prehistoric Foundations of the Early Arabian Civilization in Oman, Ministry of Heritage and Culture, Sultanate of Oman, 2018 (PDF) pp:385-396
- Frenez, Dennys. The Indus Civilization Trade with the Oman Peninsula, In the Shadow of the Ancestors. The Prehistoric Foundations of the Early Arabian Civilization in Oman, Ministry of Heritage and Culture, Sultanate of Oman, 2018 (PDF) pp:385-396
- Age-old ties between Oman and Pakistan, Times of Oman, 14 Aug 2018  
<https://www.pressreader.com/oman/times-of-oman/20180814/282020443128731>
- Age-old ties between Oman and Pakistan, Times of Oman, 14 Aug 2018
- Artefacts show Indus Valley, Omani civilisation contact, December 25, 2017

<https://timesofoman.com/article/124618>

- Anchi Huh, Ancient Oman. Archaeological Digs and Historical Discoveries in the Sultanate of Oman, May 16, 2018
- Gensheimer, T. R. (1984). "The Role of shell in Mesopotamia : evidence for trade exchange with Oman and the Indus Valley". *Paléorient*. 10: 71–72.
- <https://blogs.loc.gov/international-collections/2018/05/ancient-oman-archaeological-digs-and-historical-discoveries-in-the-sultanate-of-oman/>
- <https://economictimes.indiatimes.com/news/international/world-news/excavation-in-oman-finds-link-to-indus-valley-civilisation/articleshow/36437670.cms>
- [https://www.business-standard.com/article/pti-stories/excavation-in-oman-finds-link-to-indus-valley-civilisation-114061200550\\_1.html](https://www.business-standard.com/article/pti-stories/excavation-in-oman-finds-link-to-indus-valley-civilisation-114061200550_1.html)
- Frenez, Dennys, Michele Degli Esposti, Sophie Mery & Jonathan Mark Kenoyer, Bronze Age Salūt (ST1) and the Indus Civilization: recent discoveries and new insights on regional interaction, pp.107-124. Proceedings of the Seminar for Arabian Studies, Volume 46, 2016
- Bates, J. (1986). "Approaching rice domestication in South Asia: New evidence from Indus settlements in northern India". *Journal of Archaeological Science*. 7R (22): 193–201.

## سنڌي ڪهاڻيءَ جو جديد حوالو بادل جمالي

ڪهاڻي ڪنهن به واقعي يا حادثي جو تخيلاتي ۽ تصوراتي اظهار آهي. هونئن ڪو واقعو يا ڪنهن حادثي جو ٿيڻ ڪا وڏي ڳالهه ناهي، هر روز اسان جي آسپاس ڪو نه ڪو واقعو يا حادثو ٿيندو رهي ٿو. بلڪ ايترا واقعا ۽ حادثا ٿين ٿا جو ڪنهن به واقعي يا حادثي تي اسان جهڙو ڪر سوچڻ ئي ڇڏي ڏنو آهي. خاص طور وٻا جي هنن ڏينهن ۾ جهڙو ڪر موت جي مند اچي وئي آهي. موت ايترو عام ٿي ويو آهي جو ان جي دهشت ۽ وحشت ختم ٿي وئي آهي. زندگي هڪ ائبسٽريڪٽ دور ۾ هلي رهي آهي؛ جنهن ۾ ڪنهن به وقت ڪجهه به ٿي سگهي ٿو. اسان مان ڪوئي به ڪنهن به وقت مري سگهي ٿو. يعني موت به ڪو وڏو حادثو ناهي رهيو. پر ڪهاڻي جو لکڻ يقيناً وڏي ڳالهه آهي. ڇاڪاڻ ته ان ۾ زندگي آهي، ۽ اصل حسن زندگيءَ ۾ ئي آهي. بادل جمالي زندگيءَ جو ڪهاڻيڪار آهي. هن جي ڪهاڻين ۾ زندگي آهي. سندس ڪردارن وٽ مقصد آهن، جستجو آهي، ويچار آهن، سوچ آهي، حوصلا آهن، عزم آهي، ۽ هو زندگيءَ سان پيار ڪن ٿا. ڀلي جو اها زندگي ڪٿي زهر جهڙي به ڇو نٿي ٿي پوي؛ پر هو زندگيءَ سان پيار بلڪه عشق ڪن ٿا. زندگيءَ سان پيار جي ڪهاڻيءَ جو لکڻ موت کان وڏو حادثو آهي. تاريخدان اهو ٻڌائيندو آهي ته ”فلان دور ۾ هيئن ٿيو هو.“ فلسفي ان جو سبب ٻڌائيندو آهي ان ”ٿيڻ“ جي پويان ڪهڙا ڪارڻ هئا؛ ڪهاڻيڪار ۽ شاعر نه صرف رونما ٿيل واقعن جي معروضيت کي لفظن جي تيز ۽ تڪي ڌار سان چهن ٿا بلڪه انهن واقعن جو آڱر، پيچو، اثر، نتيجا ۽ ايندڙ دور جي امڪاني پيچ ڊاهه کان به آگاهه ڪن ٿا. ان جي ڪري تخليقڪار کي تاريخدان توڙي فلسفي کان مٿانهون سڏيو ۽ سمجهيو ويو آهي.

ناج بلوچ لکيو هو، ”تخليقي عمل، اصل ۾ فرد جي اندر کان ٻاهر، سفر جو نالو آهي. قلمڪار انساني فطرت جي بيتابين ۽



تضادن جي ادراڪ کانپوءِ ئي قبول ٿي. وڳو بڻجي ٿو. ۽ لکيل حرف کي وقار بخشي ٿو. سول سوسائٽي ۾ سڃاڻجڻ ۽ خاص رتبي تي پهچڻ لاءِ جاکوڙي ٿو. هن جي سڃاڻپ ۽ اعلى پند اصل ۾ انجي سماج جي لاهين چاڙهين جو عڪاس هجي ٿو. روايتي سنڌي ڪهاڻي/افسانو ننڍي کنڊ ۾ بالزاک، موباسان، چيخوف، اوھينري، منشي پريم چند ۽ ٻين وڏن لکارين جي تسلسل ۾ ڄاتو سڃاتو وڃي ٿو. نادر بيگ مرزا پهريون ڪهاڻيڪار آھي جنھن ڪھاڻي جي نيت ورڪ ۾ فني باريڪين ۽ جزئيات جي اھميت کي اجاگر ڪيو. ۽ سنڌي سماج جي اٿل پٿل کي نمايان ڪيو. ۽ هڪ نئين انداز سان پنهنجي معاشري جي هاڪاري ۽ ناڪاري قدرن کي چٽيو.

نادر بيگ مرزا کان بادل جمالي تائين سنڌي ڪهاڻيڪارن جي چڱي خاصي فهرست بڻجي ٿي، پر انهن ڪهاڻيڪارن جو انگ ٿورو آهي، جن پنهنجي ڊڪشن، اسلوب، ٻولي، مڪالم، موضوعن، منظرنگاري، ترتيب ۽ پيشڪش جي آڌار پنهنجي الڳ سڃاڻپ جوڙي آهي. بادل جمالي انهن ٿورڙن ڪهاڻيڪارن مان آهي، جن جي لکڻ جو انداز، ڊڪشن، ترتيب ۽ پيشڪش الڳ آهي. گهڻو ڪري هو ڪهاڻي کي هورڙيان هورڙيان ڪلائيمڪس طرف ڪڍي وڃي ٿو جنهن سبب سندس ڪهاڻيون گهڻو ڪري ڊگهو هونديون آهن. جنهن لاءِ بادل جمالي لکيو آهي ته ”ڪهاڻي جي ڊيگهه ۽ ويڪر کي ڪنٽرول ڪرڻ ليکڪ جي وس ۾ نه هوندو آهي. ڪهاڻي وڻ جي مثل هوندي آهي. ڪي وڻ قد ۾ ننڍا پر ٿلهاءِ ۾ ويڪرا هوندا آهن، جيئن انب جو وڻ، پير جو وڻ، پيا وري ٿلهاءِ ۾ سوڙها، اوچائيءَ ۾ تمام ڊگها هوندا آهن، جيئن بيد مُشڪ جو وڻ. ڪهاڻي کي زوريءَ گهٽي، ننڍي ڪرڻ جي ڪوشش ڪبي، ته اها پندري، گجبي ۽ ڊينڊري ٿي پوندي. ان جو قدرتي حسن مارجي ويندو.“

بادل جمالي جي هن پٿراگراف مان لڳي ٿو ته هو ڪهاڻي کي ”بونساءَ“ ڪرڻ جي حق ۾ ناهي. هر ’جينيئن‘ تخليقڪار ڪنهن به قسم جي ”بونساءَ“ جي خلاف ئي هوندو. ”بونساءَ“ عالمي ادب جو موضوع آهي. بونساءَ هڪ ٽيڪنيڪ آهي، جيڪا 1970ع ڌاري جاپان ۾ شروع ٿي، جنهن تحت وڏن وڻن جون پاڙون ڪٽي ڪٽري انهن کي ننڍڙين ڪونڊين ۾ رکيو ويو ۽ ٻڙ، ٺالهي، سرينهن ۽ نر جهڙا اجگر وڻ به ڊينڊڙا ٿي ڪونڊين ۾ قيد ٿي ويا. اخلاق انصاري ”بونساءَ“ ڪهاڻي لکي فرد جي وجود جي نفسياتي قيد

خاني ڏانهن اشارو ڪيو هو، ۽ بادل جمالي جي مٿين پٿراگراف ۾ ”ڪهاڻي، جي بونساء“ ڏانهن اشارو آهي، جيڪا ڳالهه بادل جمالي جي ڏاهپ جو دليل آهي. منهنجي سامهون بادل جمالي، جون 9 ڪهاڻيون آهن. جن جا عنوان هي آهن.

1. امان وڏي
2. ارڏايون عشق جون
3. پرينءَ جي پگهار
4. پُلصراط جو سفر
5. مثل هليو ميلي تي
6. پلانڊ
7. نفيس خواب ريشمي خواهشون
8. گري گوندر ول جي
9. چونڌري تي چڻنگ

هنن مان هر ڪهاڻي هڪ ’ماسٽر پيس‘ آهي. هر ڪهاڻيءَ جا ڪردار زندگيءَ سان پيار ڪن ٿا. هر ڪهاڻيءَ ۾ هڪ ڪائنات آهي. جنهن جي پنهنجي سونهن آهي، رنگ آهن، حسن آهي، خوشبوءِ آهي، ۽ مهڪار آهي. بادل جمالي جي ڪهاڻين جو ٻيو مجموعو ”سنگرام“ به هو، جنهن ۾ ڪل 13- ڪهاڻيون ڏنل هيون. جن ۾ 1- پورو ڳلاڻي، 2- نباح، 3- جيون جي زنجيرن ۾ جڪڙيل شخص، 4- سمنڊ تي وسندڙ ڪڪريءَ ۾ ڪتل اڪيون، 5- سڪون جي تلاش، 6- ويچارو انسان، 7- گهگهه اونداهيءَ ۾ ڪسجي ويل ٽارچ، 8- نوابي، 9- خواب نٿا نيشن ۾ ماڻن، 10- سنگرام، 11- هلندي هلندي، 12- هو جيڪو سٽري نه سگهيو، 13- ڪٿيرو.

سنگرام جي پهرين ڪهاڻي ’پورو ڳلاڻي‘ بهراڙيءَ جي ماحول ۾ لکيل آهي. بلڪ جيڪڏهن ايئن چئجي تڏهن به غلط ڪونه ٿيندو ته بهراڙيءَ جي ماحول جي ڪهاڻيءَ کي جتي نسيم ڪرل ڇڏيو هو، اتان بادل جمالي اڳتي ڪڍيو آهي. ساڳي ٻوليءَ جي حسناڪي، ساڳيو مڪالمن جو مها ساگر، ساڳي ڳوٺاڻي منظر نگاري پر پيشڪش الڳ، لهجو الڳ، ٽريٽمينٽ ڌار. بادل جماليءَ ڳوٺاڻي ڪهاڻيءَ کي جدت عطا ڪئي آهي. ساڳيءَ ريت سندس ٻي ڪهاڻي خفتي به ڪمال جي ڪهاڻي آهي. جنهن ۾ رچ ڪتي جي بچ جو احوال ڏنل آهي، ۽ ڪتي جي تعريف ٻڌڻ کانپوءِ شاھ صاحب اهو ڪتو وٺڻ لاءِ ان جي مالڪ دلو لوهه وٽ وڃن ٿا، پر خفت جي اصولن جي خلاف ڪتو جو ملهه

لڳائين ٿا جنهن تان دلو لوهر ڪاوڙجي پئي ٿو ۽ سندس غير موجودگي، ۾ شاھ پنهنجي ڪمدار لاهوتي، سان گڏ لوهر جو ڪٽو ڪاهي ٿا وڃن ته دلو لوهر بندوق کڻي سندن پويان لڳي ٿو ۽ ڪاوڙ ۾ اچي ڪٽي تي فائير ڪري ان کي ماري ڇڏي ٿو. بادل جمالي، جي هي، ڪهاڻي ”خفتي“ نسيم ڪرل جي ”پهرين مراد“ جو نئون جنم آهي. جنهن ۾ هو چوري، جي پوري مينهن ڪهي پيري ٿي آيل پاڳين کي ڪارائي ٿو. ۾ مينهن جي چوري نٿو باسي جو اها سندس ”پهرين مراد“ يعني پهرين چوري هئي. اهي چوراڪاري جا اصول هئا؛ جن تي نسيم ڪرل قلم کنيو هو. ”خفتي“ ۾ بادل جمالي، ڪتن جي شوقينن جي اصولن جي ڳالهه کي مرڪز بڻايو آهي؛ هو ڪٽو ماري ڇڏي ٿو، ۾ پئسن عيوض ڪٽو نٿو ڏئي. بادل جي ڪهاڻي پورو ڳلائي به ڪلاسيڪل ڪهاڻي آهي؛

”فيصلي جي خبر مون کي ڪانهي. باقي تو ته مڪڻ مان وار ڪڍي ڇڏيو! تن هزارن جي اٺ جا ٽي هزار پُنگ ٻڌي ويٺو آهين. ٽي هزار ڏيئي مالڪ نئون اٺ نه وٺي اچي.“

اها لوڪ ڏاهپ آهي، اها ڳوٺاڻي دانائي آهي، جنهن ڏانهن بادل جمالي، اشارو ڪيو آهي.

منهنجي سامهون بادل جمالي، جي پهرين ڪهاڻي ”آمان وڏي“ ڳوٺاڻي ماحول جي هڪ ڪلاسيڪل ڪردار تي لکيل آهي. اهڙا ڪردار سنڌ جي هر ڳوٺ ۾ اڄ به موجود آهن؛ جيڪي سراپا نيڪي آهن. هن ڪهاڻي، جو هي، ڊائيلاگ زندگي، جي پرپور حسناڪي ۽ باوقار موت جو دليل آهي.

”رب منهنجا، موت ۾ حق آهي، مرڻ کان انڪار ڪونهي، مالڪ سائين، هڪڙو منهنجو عرض ضرور آگاهانجان، مون کي ان گُڙدن واري بيماري، کان بچائجان!!“

هن جملي ۾ لڪل زندگي، خودداري ۽ وقار لاءِ انسيت اهوئي محسوس ڪري سگهي ٿو؛ جنهن باوقار طريقي سان زندگي گهاري هوندي. هن ڪهاڻي، جو مرڪزي ڪردار ”آمان وڏي“ سموري خاندان جي مخالفت توڙي ناراضگي برداشت ڪري به هڪ آگاهي جي مدد ڪري ٿي. اهو جذبو ئي اصل ۾ زندگي، سان پيار ۽ انسانيت جي مرندڙ تصور ۾ صور اسرافيل آهي. هن ڪهاڻي، جو مرڪزي ڪردار ”آمان وڏي“ پنهنجي شفيق، باجهاري، نيڪ ۽ انسان دوست طبيعت سبب سموري ڳوٺ ۾ مشهور آهي. هو، پلي پار جي زيارت لاءِ گڏ ڪيل پئسا ڳوٺ جي هڪ



عورت جي مريض پٽ جي اعلاج لاءِ ڏئي ڇڏي ٿي، توڙي جو ان تي سندس پٽ، ننھرون ويندي ڏيئرون به ڪاوڙجن ٿيون، پر هو، غريب جي مدد ڪري ٿي. حقيقت ۾ وڏي ثواب جو ڪم اهوئي آهي ته ڪنھن جي جان بچائي وڃي. اهو هڪ ڪائناتي سچ به آهي ته خدا کي پنھنجي مخلوق تعامر گھڻي پياري آهي، ۽ تصوف ۾ ته ”الخلق عيال الله“ يعني مخلوق خدا جو خاندان آهي؛ تائين چيل آهي. هن ڪهاڻي ۾ انسان دوستي، جو هڪ اهڙو مثال قائم ڪيل آهي، جنھن تي عمل ڪري انسانيت کي عظمت جي معراج تائين پهچائي سگھجي ٿو. ڪهاڻيڪار پنھنجي فن وسيلي انسانيت جي اهڙي خدمت جو درس ڏئي سچ ته سماج کي نئين رستي تي آڻي ٿو، جنھن ۾ فلاح ۽ بهبود آهي. بادل جمالي اهڙي ڪهاڻي لکي جس لهڻو. هن درست انداز ۾ هڪ ڪلاسيڪل ڪردار کي ڪهاڻي ۾ آندو آهي.

سندس ٻي ڪهاڻي ”ارڏايون عشق جون“ به ڪمال جي آهي. هر جملو ڪوٽ ڪوٽ جهڙو آهي،

”ڇا محبت به گھري وٺي آهي سر؟ محبت کي ته پنھنجي الڳ لينگوئيج هوندي آهي. اکين جي پٽلين مان، ساهن جي بي ترتيبيءَ مان، بدن جي بي چينيءَ مان ۽ چپن جي چُر پُر مان ان کي پڙهي ٿو سگھجي. بشرطيڪ، ايتري گھرائي ۾ ويڃڻ جي ڪنھن ۾ صلاحيت به هجي!“

هيءَ ڪهاڻي بنيادي طور تي شهري ڪلچر جي ڪهاڻي آهي، جنھن ۾ ٻي ٽي وي ۾ نوڪريءَ لاءِ لکت جو امتحان ڏيڻ لاءِ ايندڙ چوڪريءَ کي ٿوري دير سان پهچڻ امتحان هال ۾ پهچڻ تي اتان جو انچارج امتحان ڏيڻ جي اجازت نٿو ڏئي ته امتحان ڏيندڙن مان هڪ نوجوان اٿي بيهي ٿو ۽ دليلن سان انچارج کي مجبور ڪري ٿو ته هو چوڪريءَ کي امتحان ۾ ويهڻ ڏئي ۽ آخر هو ان کي اجازت ڏئي ٿو. چوڪريءَ کي ان جو اهو عمل وڻي ٿو ۽ هو، سندس ٿورا مڃڻ چاهي ٿي پر هو ٻيهر ڏئي هليو وڃي ٿو؛ پر آخرڪار هو، پنھنجي محسن کي ڳولهي لهي ٿي. ساڻس ملي ٿي، سندس خيالن کان متاثر ٿي ٿي، ساڻس شادي ڪرڻ گھري ٿي. پر سماج جو طبقاتي فرق سامهون اچي ٿو. آخر شينا(ڪهاڻيءَ جي هيروئن) جو پروفيسر ٻي هنن شرطن تي نڪاح ڪرڻ تي راضي ٿئي ٿو ته،

1 شاديءَ لاءِ ڪابه روائي خوشي ڪانه ملهائي، جڃ ڪانه ايندي.

2 گھوٽ سان گڏ، نڪاح لاءِ فقط مولوي ۽ ٽي شاهد ايندا.

3 نڪاح، رات يارهين کان پوءِ لوڊشيدنگ دوران ٿيندو. ڪابه

روشني نه ٿيندي.“



سڀ شرط مڃجن ٿا. پر نڪاح پوڻ کانپوءِ پروفيسر کي دل جو دورو پوي ٿو ۽ نڪاح پڙهندڙ مولوي ئي سندس نبض چڪاسي ”انالله“ پڙهي ٿو.

فڪري لحاظ کان هيءُ ڪهاڻي سماج ۾ موجود طبقاتي فرق تي زبردست تنقيد آهي. بلڪ ”سوکالڊ وڌماڻهائپ يا وڌ گهراڻي“ تي چتر ته آهي ئي پر هن ڪهاڻيءَ ۾ اهڙي رويي جي شڪست به ڏيکاريل آهي، جيڪا ڪهاڻيءَ کي مٿي کڻي ٿي.

ڪهاڻي ”پرڻ“ جي پگهار هڪ درد ڪٿا آهي. جنهن ۾ بادل جمالي درد کي پوکيو آهي. جيڪو پڙهندڙ جي دل ۾ هوريان هوريان ڦٽي ٿو ۽ آخر درد جو درخت بڻجي پڙهندڙ کي پنهنجي چانو ۾ ويهاري ڇڏي ٿو. هيءُ ڪهاڻي پڙهندي ڪيئي ڀيرا اکين جون پنبڻيون پنيون آهن هيءُ هڪ اهڙي نوجوان جي ڪهاڻي آهي. جيڪو مئٽرڪ پاس آهي. ۽ شهر جي ڪنهن اسپتال ۾ گارڊ آهي. هو اسپتال جي هڪ نرس سان اڪيون چار ڪري ويهي ٿو، پر ڳوٺ سندس پيرسن پيءُ ماءُ ۽ پيرون سندس رستا ڏسن ٿيون ته هو ايندو ۽ ڪجهه ڏيندو ته جيئن گهر جو گاڏو ڳڙي. هو ڪجهه ڏينهن کان پوءِ ڳوٺ اچي ٿو، پر پيءُ کي گهٽ پئسا ڏئي ٿو ۽ ايترو ڪاوڙ ۾ ڪو طعنو به ڏئي ٿو وٺي، جنهن تان دل شڪستو ٿي سندس پيءُ اهي پئسا هڪ خط سان گڏ سندس ئي ٿيلهي ۾ رکي ٿو ڇڏي هو جڏهن شهر پهچي ٿو ته ٿيلهي ۾ پئسن خط به کيس ملي ٿو؛ جنهن جو لفظ لفظ درد جي دانهن آهي. ”پرڻ پٽ ٽن مهينن کان پوءِ خير سان آيو آهين. اسان اهو وقت هڪڙو هڪڙو ڏينهن ڳڻي، تنهنجي انتظار ۾ گذاريو آهي. اسان جي لاءِ تون ”انڌي جي لٽ“ آهين. معصوم ٻارن وانگر، هر ڳالهه ۾ توڏانهن ٿا ڏسون توکان ئي ٿا گهرون..... اڄ خبر پئي ته اسان جي ڪري تون پنهنجين خواهشن جي نڙيءَ تي لٽ ڏيو بيٺو آهين. ننڍين ننڍين شين لاءِ به پاڻ کي سڪائين ٿو. اسين توکي ڳجهن وانگر پٽيندا ٿا رهون.....!! اهو ٻڌي، سچ پچ ته اسان پنهنجي نظرن ۾ ئي ڪري پيا آهيون. بيشڪ تون اسان کي پالين ٿو. ڪارائين پيئارين ٿو. تنهنجو اهو احسان لاهي نٿا سگهون. پر پٽ، احسان جي بدلي، ماءُ پيءُ کي پادر ۾ پائي ته نه پيئار.....!!! دل تي پٿر رکي، تنهنجي ڏنل رقم، واپس ڪيون پيا. ڀلي تون پنهنجا شوق پورا ڪر. عمدو وڳا پاءُ، ڀلا بوٽ پاءُ، تڄ موبائل ڪڍي گهر. اها غربت، بڪ ۽ بيماريون ننڍي لاکون اسان کي ورثي ۾ مليون آهن، پيا انهن سان ڳڻ ڏينداسون. شال سدائين سڪيو ستابو هجين، ڪڏهن ڪوسو

واء نه لڳي ئي. اسان جي دعا اها اٿئي پرين. فقط تنهنجو بابا. نوجوان خط پڙهي تر ت ڳوٺ موٽي ٿو پيءُ کان معافي وٺي ٿو، پيءُ پٽ کي راضي ڏسي ان ئي ڏينهن سندس سوٽ سان شادي ڪرائي ٿو ڇڏي جنهن ۾ هو راضي ته نه هو، پر انڪار نه ڪري سگهيو. ڪهاڻي پنهنجي اصل ڪلائيمڪس يعني ”درد جي معراج“ تي ان وقت پهچي ٿي جڏهن اها چوڪري پنهنجا ڏينهن پورا ڪري سور کائي ٿي ۽ نوجوان کي شهر مان موڪل نٿي ملي جيئن تئين ڪري موڪل وٺي هو جڏهن ڳوٺ جي اسپتال ۾ پهچي ٿو ته سندس گهرواري غلط آپريشن يا ڊليوري جي ڪنهن ٻي ڪامپليڪشن سبب فوت ٿي وڃي ٿي ۽ آپريشن ڪري ڪڍيل ٻار به گذاري وڃي ٿو. پر پئسا پورا نه ڏيڻ سبب اسپتال جي انچارج ڪين لاش نٿي ڏئي. نوجوان پئسا انچارج کي ڏئي ٿو ۽ چوي ٿو، ”آئون“ زينب جو مڙس آهيان مئڊم. هي اوهان جي بل جا باقي پئسا... پئسا ڳڻي ”نيڪ“ چئي مئڊم دراز ۾ رکيا. هو وڃڻ لاءِ مڙيو ته پويان آواز آيس:

”انتھائي لاپرواهه ۽ غير ذميدار ماڻهو آهيو اوهين ڳوٺاڻان..... مريضه کي ائڇڻاڻ دايڻ هٿان پٽائي. ڦٽائي. مرڻينگ ڪري پوءِ ڪٿي ٿا اچو اسان وٽ. ته هاڻي بچايوس، وقت تي پهچايوس ها، ته بچي نه پوي ها؟ جڏهن پالي نه ٿا سگهو، ته پوءِ ڇڻيو ڇو ٿا... اوهان بلڪل درست فرمايو آهي مئڊم.. اسان ۾ ٿورو به شعور هجي ها، ته پنهنجي، عورت کي ڪنهن ساڪ واري، اسپتال ۾ داخل ڪرايون ها، جتي ماءُ سان گڏ، ٻار به بچي پوي ها. اسان وڏي بيوقوفي ڪئي، جو ڪوس گهر کي اسپتال سمجهي، پنهنجي مائي، کي ڪاسائي، حوالي ڪري، هٿن سان مارايوسون.....! هو ڳالهه پوري ڪري، هليو به ويو. پر مئڊم اڃان تائين دروازي ۾ اڪيون وجهي، بي حس و حرڪت ويٺي رهي. جهڙوڪر ڪنهن ڪانس چرڻ پُرڻ واري طاقت ڦري، کيس بي جان بت بنائي ڇڏيو هجي...!“

حقيقت ۾ هي، هڪ وڏي ڪهاڻي آهي، ڇاڪاڻ ته هي، غريب طبقي جي هر گهر جي ڪهاڻي آهي. هڪ رپورٽ موجب اسپتالن ۾ دير سان پهچڻ ۽ ڊليوري ڪامپليڪشن تحت هر سال رڳو سنڌ ۾ هڪ لک ٻارن مان 224 ٻار يا انهن جون مائرون ڊليوري ڪامپليڪشنس جي ڪري موت جي منهن ۾ هليون وڃن ٿيون، بلوچستان ۾ اهو انگ 298 آهي. بادل جمالي نه صرف هڪ اهڙي مسئلي تي ڪهاڻي لکي آهي، بلڪه ان جا سبب پڻ ڄاڻايا آهن، جن مان لڳي ٿو ته هو هڪ سڃاڻ ڪهاڻيڪار آهي، جيڪو نه صرف ڪهاڻيون لکي ٿو بلڪه هو سماج جو گهرو اڀياس پڻ ڪري ٿو.

بادل جمالي جي ڪهاڻي ”پُلصراط جو سفر“ به ڪمال جي ڪهاڻي آهي. جنهن ۾ هڪ ڳوٺاڻو پنهنجين نياڻين کي تعليم ڏيارڻ واسطي کين ڪراچي، ۾ سيٽل ڪري ٿو ۽ هو پاڻ سعودي عرب وڃي ڪمائي ٿو. هن جون ٽي نياڻيون آهن جن مان ريشم سڀني کان ننڍي هئي. جيڪا هنڌ هنڌ ”چائلڊ سيڪس ابيوز“ جو شڪار ٿئي ٿي. ڪٿي کيس ڪلاس فيلو تنگ ٿو ڪري ته، ڪٿي مولوي ته ڪٿي ڊڪاندار ۽ ڪنڊيڪٽر. هو، اهي سڀ شڪايتون اچي پنهنجي ماءُ کي ڏئي ٿي، جيڪا کيس سمجهڻ بدران ابتو مٿس ئي الزام ڌري ٿي ۽ پنهنجي وڏي، ڏي، کي چوي ٿي؛ ”مائي هن جون دانهون ٻڌي ٻڌي، منهنجا ته ڪن پڇي پيا آهن. اهڙي پڙهائي، کان ته جهالت پلي. جو ماڻهو گهر ۾ عزت سان ته ويٺو هوندو.“

جيڪا کيس ورندي ڏئي ٿي ته؛  
 ”اها ته هن جي سڃاڻي آهي جو هر ڳالهه تو تائين پهچائي ٿي. توکانسواءِ ڪهڙا هن جا چاچا ماما هتي وينا آهن، جيڪي هن جو داد ڪندا؟ تون ته هن کي شاباشي ڏي، جو وڙهي جهڙي به پنهنجي آبرو بچائي ٿي اچي. اڄ ڪلهه ته ٽي وي، تان، اخبارن ۾، معصوم ٻارڙين سان ٿيندڙ زيادتين جون خبرون روز ٿيون اچن، جن مان ڪيترين کي قتل به ڪيو ٿو وڃي. معصوم ٻارڙيون، صبح شام ڏڪندڙ قدامت سان پُلصراط تان سفر ڪري، علم حاصل ڪرڻ اچن وڃن ٿيون. ۽ گهر پهچڻ تائين ساهه مٿ ۾ هوندو اٿن، ته خبر ناهي ڇا ٿئي!“

هي، به هڪ سماجي حقيقت تي ٻڌل ڪهاڻي آهي؛ جنهن ۾ سماجي پستي، ڏانهن اڳ ڪڍي وئي آهي ته فرد معاشي ۽ سماجي مسئلن سان منهن ڏيندي ڏيندي ايڏو ته ٽڪجي پوي ٿو جو هو پنهنجي ذميواري کي وساري ويهي ٿو. هن ڪهاڻي، ۾ نياڻين جي نفسياتي، اخلاقي توڙي جنسي مسئلن تي مدبرانه انداز ۾ قلم کنيو ويو آهي. هن موضوع تي بادل جمالي، جي هن ڪهاڻي، کان اڳ شايد ئي ڪنهن قلم کنيو هجي. ”چائلڊ سيڪس ابيوز“ هڪ عالمي مسئلو آهي. دنيا جي ادب ۽ آرٽ ۾ ان تي گهڻو ڪم ٿيو آهي، پر سنڌي، ۾ ان تي تمام گهٽ لکيو ويو آهي. بادل جمالي ان ٻرندڙ اشو تي دانشمندائي انداز ۾ قلم کڻي علم ۽ قلم جي حرمت کي وقار بخشيو آهي.

هن ڪتاب ۾ موجود هڪ ٻي ڪهاڻي ”منل هليو ميلي تي“ آهي، جيڪا هڪ درد جو داستان آهي. منل ٻن معصوم ٻارڙين جو ڀاءُ آهي، جيڪو ماءُ



سان رهي ٿو جو کين سندن پيءُ، گهران ڪڍي ٻي شادي ڪري ڇڏي آهي. هو ڳوٺ جي ڀرسان لڳندڙ سالياني ميلي تي وڃڻ جي خواهش ۾ پهريان ڳوٺ مان نڪرندڙ گاڏي تي سوار ٿيڻ جي ڪوشش ڪري ٿو، پر وٽس ڪرائي جا پئسا ناهن ۽ هو گاڏي، جو پويان پنڌ ڊوڙندو وڃي ٿو. جيسيتائين ڪچو رستو هو تيسيتائين ته هو گاڏي جي ڪڍ ڊوڙي ٿو، پر پڪي روڊ تي ايندي ئي گاڏي تيزي، سان نڪري وڃي ٿي ۽ هو سهڪندو سهڪندو پيرين پنڌ ميلي تي پهچي ٿو. منل وٽ ڪجهه به نه هو ان ڪري هو ڪابه شيءِ خريد نٿو ڪري سگهي ابتو ڪڏهن رانديڪن جي دڪان تان ته ڪڏهن مٺائي، جي دڪان تان ته ڪڏهن وري سرڪس تان دڙڪا بلڪ مار کائي ٿو. ميلي تي ئي هو پنهنجي پيءُ کي ويڳن ڀائرن سان گڏ مٺائي کائيندي ڏسي ٿو. پر سندس پيءُ هٿ جي اشاري سان ئي کيس پري رهڻ جو چوي ٿو ۽ پيءُ جي اهڙي رويي جو ڏک ڪشي هو اڳتي نڪري وڃي ٿو. هو ميلي ۾ موجود هر لمحي هڪ ڪرب مان گذري ٿو. آخر مايوس ٿي واپس موٽي ٿو ۽ سوچي ٿو:

”ماڻهو ڏس ته شيون وٺڻ پيا، کائڻ پيا، گهر لاءِ به ٻڌرائڻ پيا. آئون پري کان ڏسي ڏسي، اندر ۾ ڪتر ٿيندو رهيس. هيڏي ساري ميلي مان، پيو ته ٺهيو، پنهنجي معصوم پيٽن لاءِ، ننڍڙي گڏي به نه آئي سگهيس...“

گهر ۾ پهچندي ئي ننڍڙيون پيشيون کيس چنبڙي پون ٿيون، جيئن تين ڪري هو انهن کي دلآسا ڏئي مطمئن ڪري ٿو ۽ ماءُ کي زور ڏيڻ لاءِ چوي ٿو جو هو گهڻو ٽڪجي پوي ٿو ۽ کيس بخار اچي وڃي ٿو. ڪهاڻي جي پڄاڻي يا انتها ڏاڍي ڏکونيندڙ آهي. بلڪه سڄي ڳالهه اها آهي ته هيءُ ڪهاڻي پڙهندي الائي ته ڪيترا پيرا اکين جون پنبليون پسيون آهن. درد جي اهڙي چٽي تصوير ڪڍڻ تي بادل جمالي جس لهڻو.

”بخار ۾ ٻرندڙ پٽ کي زور ڏيندي هٿ سندس پيرن تائين پهتا، ته ڦلڪڻ جي تازن زخمن تي نظر پوندي ئي، هانءُ ڦسي پيس. ڏوڙيل پيرن تي چميون ڏيندي، هوءُ پاڻ به سڌڪن ۾ ٻڏي ويئي...“

بادل جي اڳئين ڪهاڻي ”پلانڊ“ پڻ هڪ خوبصورت ڪهاڻي آهي؛ جنهن ۾ هڪ ننڍڙو ٻارڙو پنهنجي ننڍڙي پيٽ سان گڏ هر هفتي لڳندڙ پڙيءَ تان موٽندڙ گاڏين ۾ پنهنجي پيءُ کي ڳولهي ٿو، جيڪو کين نٿو ملي، ڇاڪاڻ ته سندن پيءُ جو سعودي، ۾ ايڪسيڊنٽ ٿيو هو، جنهن کي اتي ئي دفنائڻ ڇڏيو هئائون. پر ٻارڙي کي ان حقيقت جي خبر نٿي ٻڌائي وڃي. آخر هڪ موالِي کيس ٻڌائي ٿو ته تنهنجو پيءُ واپس نه ايندو جو اهو



پڙي، تي ويو ئي نه هو ته مڪي ۾ ايڪسيڊنٽ ۾ فوت ٿي ويو ۽ هن کي اتي ئي دفنائڻي ڇڏيائون. ٻارڙو پنهنجي ننڍڙي پيٽ سان گڏ ڏک ۾ وڻجي وڃي ٿو ۽ گهر اچي پنهنجي ڏاڏي کان حقيقت معلوم ڪري ٿو؛ جيڪو کيس چوي ٿو موالِي ڪوڙ ٿو ڳالهائي. جنهن تي ٻارڙو پاڻ ئي ذهن ۾ سوچي ٿو ته پوئتي پڪ سندس پيءُ کي ان موالِي، قتل ڪيو آهي، ۽ هو ان جو پلاند موالِي کان وٺڻ لاءِ گهران ننڍڙي ڪهاڙي کڻي ٿو ۽ هوٽل تي ويٺل موالِي تي وار ڪري ٿو. جتي سندس مامون کيس جلديءَ ۾ سنڀالي وٺي ٿو ۽ کڻي وٺي ٿو ۽ کيس چوي ٿو،

”هي ڇا ڪيو اٿئي چريا...!“

رياض ڏڙڪو ڏيئي جوڃي، کي چيو.

”هاڻي پوليس اچي ٻڌي ڪڍي ويندي.“

”پوليس ڇو ٻڌندي ماما، مون ڪو جهيڙو ته ڪونه ڪيو.“

”پوءِ موالِي، کي رت ۾ ڳاڙهو ڪنهن ڪيو؟“

”الائي، مون ته پنهنجي جاني بابا جو پلاند ڪيو آهي...!!!“

هن ڏاڍي اطمینان سان جواب ڏنو.

هن ڪهاڻي، ۾ پڻ هڪ درد ۽ ڪرب آهي. جنهن کي بادل جماليءَ

تمام خوبصورت انداز سان بيان ڪيو آهي.

سندس ڪهاڻي ”نفس خواب ريشمي خواهشون“ آهي؛ جيڪا پڻ

بهترين ڪهاڻي آهي، جنهن ۾ هڪ هندو چوڪريءَ جو مسلمان چوڪري

سان پيار ڏيکاريو ويو آهي، جيڪي پاڻ ۾ شادي ڪرڻ چاهين ٿا. پر سماجي

بندش سبب شادي نٿا ڪري سگهن ۽ انجلي جا والدين راتو واڌ هن جي

شادي هڪ غريب پڪوڙائي سان رڳو ان ڪري ڪرائين ٿا جو اهو هندو

هو، ۽ انجلي سان پيار ڪندڙ ڪامران بلوچ مسلمان هو. انجلي ۽ ڪامران

جي وچ ۾ معصوم پيار جنم وٺي ٿو،

”ڪامران رازداريءَ واري انداز ۾ پڇيس:

”پوڄا ڪندي پڳوان کان ڇا گهريو اٿئي؟“

”منو ڪامنا.“ هن به ساڳئي رازدارانه انداز ۾ چيو.

”منو ڪامنا؟ اها ڪهڙي شيءِ آهي؟“

”من جي مراد.“

”اڃا، من جي مراد... ان ۾ ڇا؟“

”اهو پڳوان ۽ انسان جي وچ ۾ بيڪريٽ آهي، جيڪو ڪنهن ٻئي

سان شيئر ڪري نٿو سگهجي.“

هيءَ ڪهاڻي بنيادي طور تي سماج ۽ مذهب جي وچ ۾ پيدا ٿيندڙ هڪ اهڙي صورتحال جي ڪٿا آهي، جنهن جو شايد اڃا ڪوبه حل ناهي آيو. اهڙو حل هن ڪهاڻيءَ ۾ به موجود ناهي. ڇاڪاڻ ته بادل جمالي بنيادي طور تي ”سوشل ريٽلزم“ جو ڪهاڻيڪار آهي ان ڪري هن ڪهاڻيءَ ۾ ڪا به تبليغ، تبصرو يا نتيجو ناهي ڏنو. مون اڳ به لکيو هو ته وڏا ڪهاڻيڪار ڪهاڻين جي نتيجي کي پرهندڙن تي ڇڏيندا آهن. بادل جمالي لاشڪ ته وڏو ڪهاڻيڪار آهي، جنهن لڳ ڀڳ هر ڪهاڻيءَ جو نتيجو پڙهندڙ تي ڇڏيو آهي.

سندس ٻي ڪهاڻي ”گري گوندر ول جي“ به انتهائي خوبصورت ڪهاڻي آهي؛ جنهن ۾ هڪ عورت کي ثاني تي گرفتار ڏيکاريو ويو آهي، ۽ اتي شاهنواز نالي هڪ شخص جيڪو اتان جي ٿاڻيدار جو دوست آهي اهو اچي ٿو ۽ عورت کي ٿاڻي ۾ بند ڏسي ٿاڻيدار کي چوي ٿو ته عورت ٻارن ٻچن واري ٿي لڳي ڇڏيوس ته وڃي ٻارن سان ملي، جنهن تي ٿاڻيدار عورت کي اهو چئي ڇڏي ٿو ڏي ته اها عورت آهي ته ڏنڌي واري پر اوهان جي سفارش تي ڇڏيونس ٿا. هو ان عورت کي لفٽ ڏئي ٿو ۽ کيس حيدرآباد مان ڪوٽڙي اسٽاپ تائين پنهنجي گاڏي، ۾ کڻي اچي ٿو. رستي تي عورت کيس پنهنجي درد ڪٿا ٻڌائي ٿي ته سندس مڙس پناڻ هو، جيڪو ٻه ٽي سال اڳ وانا پنهنجي ماءُ سان ملڻ ويو هو، پر اتي مارجي ويو آهي، ۽ هو، تن نيائين سان گڏ بکن ۽ ڏڪن ۾ رهي ٿي. عورت کي لفٽ ڏيندڙ شاهنواز ڪوٽڙي اسٽاپ تي ڊراپ ڪرڻ وقت ڪجهه رقم ڏئي ٿو ۽ کيس ڪراچي اچڻ جو چويس ٿو. اها عورت ڪجهه ئي ڏينهن ۾ شاهنواز سان ملڻ لاءِ ڪراچي، اچي ٿي. اتي اچي کيس معلوم ٿئي ٿو ته سڪيو ستاب شاهنواز اڪيلو ٿو رهي ڇاڪاڻ ته سندس گهرواري ڪنهن ڳالهه تان ناراض ٿي ڪائنس خلع وٺي پنهنجي اڪيلي ننڍڙي ڪائنات کي به ساڻ وٺي هلي وئي آهي. ان عورت ۽ شاهنواز جي وچ ۾ ويجهڙائي ٿئي ٿي ۽ اها عورت ٻي پيري پنهنجين ٻارڙين کي به عيد جي شاپنگ لاءِ ڪراچي وٺي اچي ٿي. جن مان ننڍڙي نيائيءَ ۾ شاهنواز پنهنجي ڪائنات کي ڳولهي لهي ٿو ۽ آخر هو ان عورت سان شادي ڪري پيءُ جي شفقت کان محروم ٻارڙين کي پيءُ جو پيار ڏئي ٿو. هيءَ ڪهاڻي به درد جو هڪ داستان آهي، جنهن ۾ بادل جمالي پنهنجي ڪهاڻيءَ جي ڪردارن کي درست معنيٰ ۾ درد مان نڪرڻ جو گس ڪڍي ڏئي ٿو. حقيقت ۾ ڪهاڻيءَ جي ڪردارن کي ڪهاڻيڪار جڏهن ڪنهن ڊپٿ مان ڪڍي جڏهن سنئين دڳ يا خوشيءَ جي

واٽ تي آئي ٿو ته هو جهڙوڪر سماج جي بهتريءَ ۾ پنهنجو حصو داخل ڪري ٿو. اهڙا ڪهاڻيڪار اصل ۾ ”سوشل ريفارمسٽ“ هوندا آهن. بادل جمالي پنهنجين ڪيترين ئي ڪهاڻين ۾ سوشل ريفارمسٽ ٿي ڪري سامهون اچي ٿو.

ڪهاڻي ”چونثري تي چڻگ“ وري هڪ اهڙي ڪهاڻي آهي، جنهن ۾ ’ٿور جاتي‘/اقليت جي ماڻهن تي مقامي وڏيري جي ظلم کي موضوع بڻايو ويو آهي. هن ڪهاڻيءَ ۾ منظر نگاري ۽ ٻولي ڏاڍي خوبصورت آهي. خاص طور ڪهاڻيڪار ميگهواڙن جي ڍاٽڪي ٻوليءَ ۾ جيڪي مکالما لکيا آهن انهن جو جواب ناهي. اهو هنر اسان جي گهڻن ڪهاڻيڪارن کان موڪلائيندو ٿو وڃي ته جنهن ڪردار جي هو ڳالهه ڪن ٿا ان جي ٻولي ۽ لهجو ان ڪردار لاءِ لکن. ڪجهه سال اڳ انور ڪاڪا اهڙي ڪهاڻي لکي هئي جنهن ۾ هن ميگهواڙن جي ئي ٻوليءَ ۾ انهن جا ڊائلاگ لکيا هئا. هاڻي هتي بادل جمالي هن ڪهاڻيءَ ۾ ساڳي طرح انهن جي ئي ٻوليءَ ۾ سندن ڊائلاگ لکيا آهن. جيڪو هڪ سٺو ۽ سهڻو آرٽ آهي. نه ته عام طور ڪهاڻيڪار ائين نٿا ڪن؛ ان جو هڪ سبب اهو به آهي ته اسان جا گهڻا ڪهاڻيڪار سماجي لسانيات کان واقف ناهن، ان ڪري هو صرف ادبي ٻوليءَ ۾ ئي ڪهاڻيون لکن ٿا. هونئن ته ائين گهرجي ته جنهن به ڪردار جي ڳالهه ڪجي؛ اها ان ڪردار جي پنهنجي ئي لب ۽ لهجي ۾ ڪجي. بادل جماليءَ وٽ اهو هنر اوس موجود آهي. هن ڪهاڻيءَ ۾ هڪ پاسي ڍاٽڪي ٻولي آهي ته ٻئي پاسي منظرن جي سونهن به ڪمال جي آهي، مثال، ”ٻئي گڏجي تازو پوکيل وڻن جي فصل جو جائزو وٺڻ لڳا... ڪرن جي ٻنهي پاسي، گرانٽ جيڏا ساوا ٻوٽا هوا ۾ جهومندي، ائين لڳي رهيا ها، ڄڻ ٻاراڻي اسڪول جا معصوم شاگرد، هٿن ۾ ننڍڙيون سايون جهنڊيون کڻي، ڪنهن سياسي ليڊر جي آجيان لاءِ قطارون ڪري بيٺا هجن...!!“ صحتمند ٻوٽن کي ڏسي، راموءَ جي دل بهار ٿيڻ لڳي.“ بادل جمالي جهڙوڪر لفظن کان ڪئميرا جو ڪم ورتو آهي. لفظن ۾ بيان ڪيل منظر پنهنجي پرڀور حسناڪيءَ سان اسان جي سامهون اچي وڃي ٿو. هن ئي ڪهاڻيءَ ۾ طبقاتي نظام تي پڻ جلوه ڪئي وئي آهي؛ جيئن:

”سوچ ته سهي، پنهنجي ڪاڪي پراج واري مُلڪ ويندي. بجلي ٻاريندي، گئس تي پڇائيندي، ڪڇڪ کائيندي، ٺُل جو پاڻي پيئندي. لارين ۾ گهمندي، ان کان وڌيڪ پاڻ کي ڇا ڪبي؟ هتي جا ڏڪار سدائين اسان پوڳيا آهن. آئين ڪائين سان گڏ ٻريا آهيون، ڍورن، ڪُتن ۽ گڏهن سان گڏ



ڏيئي جو پاڻي پيتو سون. ڏي، جو بخت وريو آهي، ته خوش ٿي، ته تنهنجي ڪاڪي سڪي ستابي زميندار گهر ۾ وڃي پئي. سماجي طور هر ماڻهو سڪيو ستابو رهڻ چاهي ٿو. پر اهو سڪ ڪڏهن ڪڏهن سندس ڏک به بڻجي وڃي ٿو. جيئن هن ڪهاڻي، ۾ ٻڌايل آهي. انهن ئي ميگهواڙن جا پنجاهه ايڪڙن تي بيٺل فصل وڏيري جي اک ۾ ڪنڊو بڻجي لڳن ٿا ۽ مور جو بهانو بڻائي هو سندن گهرن کي باهه ڏياري ايتو مٿن ئي کيس ڪري ٿو. جنهن ۾ هن ڳوٺ جا چڱا جهلجي ٿا پون. سماج جي بي حسيءَ کي هن ڪهاڻيءَ ۾ ڪيڏي نه خوبصورت انداز ۾ پيش ڪيو ويو آهي. لاشڪ بادل جماليءَ وٽ لفظن جا خزانو آهن، هن وٽ افسانن جا انبار آهن، هن وٽ پيشڪش جا مختلف رنگ ڍنگ آهن، ۽ هن وٽ ڪهاڻين ۾ حقيقت پوڻ جو هنر آهي.

اها به هڪ حقيقت آهي ته بادل جماليءَ جي هر هڪ ڪهاڻيءَ جو پلاٽ، ٻولي، منظرنگاري توڙي مڪالما تمام گهڻا خوبصورت آهن. هو ٻوليءَ جو شاهه ڪاريگر آهي.

بادل جمالي جي ڪهاڻين جون ڪي خاص خوبيون آهن، جيڪي گهڻو ڪري عام ڪهاڻيڪارن ۾ ناهن. هو ڪهاڻيءَ کي بلڪل آخري نتيجي تائين نٿو ڪڍي وڃي. بلڪه نتيجو پڙهندڙ تي ڇڏي ڏئي ٿو. اهو هنر وڏن ڪهاڻيڪارن وٽ هوندو آهي، ڇاڪاڻ ته هو پنهنجن پڙهندڙن کي گمراهه ناهن ڪرڻ چاهيندا، بلڪه هو سندن عقل ۽ شعور جي سطح مٽائين رکن چاهين ٿا. ان ڪري ئي ڪهاڻيءَ کي نتيجي تائين پهچائڻ کان اڳ پاڻ ڪهاڻيءَ کان ڌار ٿي وڃن ٿا. ساڳيو هنر ڊاڪٽر رسول ميمڻ ۽ اخلاق انصاريءَ جي ڪهاڻين ۾ به آهي. بادل جماليءَ جون اڪثر ڪهاڻيون ڊگهيون آهن، جن ۾ هو گهڻو ڪري منظرنگاري ۽ مڪالمن تي گهڻي توجهه ڏئي ٿو. بادل جمالي سنئون سڌو ڪنهن نظريي تحت نٿو لکي پر سندس اڪثر ڪهاڻيون سماجي حقيقت نگاريءَ جي زمري ۾ اچن ٿيون. ۽ امر لغاريءَ موجب اهي ڪهاڻيون ”ايڪو ڪرٽسزم“ لاءِ وڌيڪ ’ريسپانس‘ ڏين ٿيون، جيڪو سچ به آهي. هو ڪهاڻين جي منظر نگاريءَ ۾ ڳوناڻو ماحول، آبهوا، پکي پکڻ، ٻوٽا، وڻ ٺٺ، جانور ۽ موسمون کڻي اچي ٿو. جن تي ”ايڪو ڪرٽسزم“ تحت گهڻو ڳالهائي سگهجي ٿو. هو پهراڙيءَ جي حسناڪين کي جنهن انداز ۽ خوبصورت ٻوليءَ ۾ بيان ڪري ٿو اسان جي سامهون نسيم کرل جون ڪهاڻيون اچي وڃن ٿيون. پهراڙيءَ جي حسن کي نسيم کرل جتي ڇڏيو هو اتان بلڪه ان کان به اڳيان بادل جمالي ان حسن، سونهن،



دلربائي ۽ دلفريبي کي کنيو آهي، ۽ ان کي نئين ٻولي ۽ لهجو عطا ڪيو آهي. بادل جمالي زندگيءَ جو ڪهاڻيڪار آهي، سندس اڪثر ڪردار جيئڻ ڪارڻ جستجو ۽ جدوجهد ڪن ٿا ۽ پنهنجو حيلو، وسيلو ۽ وس هلائي زندگيءَ ۾ آسانيون پندا ڪن ٿا. توڙي جو موت جو خوف به سندن آسپاس ئي آهي، پر هو ان مان به زندگيءَ جي چڻنگ دکائي وٺن ٿا. هو ٻوليءَ جو ڪاريگر آهي، ۽ هر ڪردار کي ان جي گهربل ٻولي ۽ لهجو عطا ڪري ٿو. سندس ڪهاڻيون پڙهڻ کان پوءِ اهو احساس ٿئي ٿو ته هو، جيڪو به ڪردار تخليق ڪري ٿو نفسياتي طور تي هو ان ڪردار جي گهرائي ۾ وڃي ان ۾ زمر ٿي وڃي ٿو؛ اهڙيءَ ريت اهو ڪردار سندس حصو بڻجي وڃي ٿو. اهڙين ئي خوبين جي ڪري بادل جمالي ڪهاڻيءَ ۾ پنهنجو الڳ مقام جوڙيو آهي. هو سنڌي ڪهاڻيءَ جي تاريخ ۾ پنهنجي لاءِ الڳ سڃاڻپ جوڙي چڪو آهي. اميد آهي ته سندس ڪهاڻين جو هيءُ چوٿون ڪتاب پڙهندڙن، لکندڙن توڙي نقادن جو ڌيان ڇڪائيندو ۽ سنڌي ڪهاڻيءَ کي هڪ نئين رخ ۾ وٺي ويندو. جتي ڪهاڻي پنهنجي ڪلاسيڪي هيٺ ۾ هوندي به جديد بڻجي پئي آهي.

## ڊاڪٽر ڦُلو ۽ ان جو لوڪ ادب: مختصر جائزو

ٿر. پنهنجي سماجي ۽ فطري پس منظر ۾ هڪ منفرد خطو آهي. جتان جي فطري سونهن. جنهن ۾ تمام وڏيون واريءَ جون پٽون ۽ صاف سٿري اچڙي واريءَ جون ڊيهون، پنهنجي ڪڪ ۾ پانت پانت جا وڻ ٿڻ ۽ ٻوٽا، جن تي پاڙيندڙ وري قسمن قسمن جانور، پکي ۽ ٻي جيوت. تاريخي طور تي هي خطو اوڀر کان اولهه ۽ اولهه کان اوڀر ويندڙن جي لاءِ لنگهه به رهيو آهي، ته ڪيترن ئي سياسي لاهن چاڙهن ۾ مختلف ذاتن. قومن ۽ حڪمران ڪندڙن لاءِ توڙي. سنڌ يا آسي پاسي جي ٻين پاسي جي رهاڪن جي دشمنن کان لڪڻ بچڻ جي پناه گاهه پڻ رهيو آهي. انهيءَ لنگهه ۽ لڪڻ جي نتيجي ۾ مختلف علائقن ۽ خطن جي مختلف ذاتين ۽ قومن مان ڪي ماڻهو اتي ئي مستقل طور ترسي پيا ۽ ٿر ۾ مختلف مذهبن، ثقافتن، ٻولين ۽ نسلن جي صدين جي ميل جول سان هڪ منفرد سماج جڙي پيو. انهيءَ صدين جي سفر ۾ جيئن مختلف مذهبن، ثقافتن، ٻولين وارا ماڻهو اتي ايندا رهيا. اڳ ۾ موجود رهاڪن نون ايندڙن جي هر شيءِ جو احترام ڪيو، ۽ ايندڙن پڻ آديواسين جي هر سماجي عنصر جي عزت ڪئي. مذهبي ڏڻ گڏجي ملهائڻ لڳا، ۽ هڪ ٻئي ۾ ضرر ٿيڻ لڳا، ۽ آهستي آهستي هڪ جهڙا ٿيڻ لڳا. مختلف مذهبن جي ظاهري بندگي ۽ عبادت ڏسڻ ۾ ته الڳ الڳ آئي ٿي، پر رواداري، ماڻهپو، انسانيت جا ڳڻ سڀنيءَ ۾ نفسياتي طور ساڳيا ۽ هڪ جهڙا رهيا. انهيءَ ميل جول ۾ ثقافت جي ٻوليءَ واري پهلوءَ کي ڪير به جڪڙي قابو ڪري نه سگهيو ۽ ٻوليون هڪ ٻئي ۾ ضرر ٿينديون ويون ۽ نتيجي ۾ هڪ الڳ ۽ نئين ٻولي ٺهي پئي؛ بلڪل اهڙيءَ طرح، جيئن مختلف ننڍيون ننڍيون ڌارائون گڏجي، هڪ وڏي نديءَ جنم ڏين ٿيون؛ اها ٻولي آهي، ڊاڪٽر ڦُلو جي ٻوتي مختلف محققن، جن ڊاڪٽر ڦُلو، تي لکيو آهي، انهن جي لکتن

مان ملي ٿي، ته وري ڏاٽڪي ٻوليءَ جي لوڪ ادب ۾ ڪم آيل لفظن ۽ ٻولين مان به. ڏاٽڪي ٻولي هڪ قديم ٻولي آهي. ڏاٽڪيءَ پنهنجي جاگرافي، پنهنجي ثقافت، پنهنجي تاريخ، پنهنجا آواز، پنهنجا لفظ پنهنجون گرامري خصوصيتون، پنهنجو لوڪ ادب، پنهنجو ادب آهي. سماجي لسانيات جي سائنس موجب هن ٻوليءَ جو پنهنجي سماج ۽ ان جي ثقافت سان گهرو ۽ اونهو ناتو آهي. انهيءَ جي ادب، خاص ڪري لوڪ ادب ۾ انسان جي شعوري ارتقا، ذهانت ۽ ڏاهپ جا تعارف وڏا گڻ سمائل آهن. جيڪي انهيءَ سماج جي اجتماعي سوچ ۽ نفسيات جي عڪاسي به ڪن ٿا. لوڪ شاعريءَ جا ڪي نمونا هيٺ ڏجن ٿا.

(سوائيا)

چنڊڻ ڪهه هون ٻاونو، مانهانجي پٿر سين پريت،  
هون گسان او نين گسه، پلپڻ ڪيسي ريت.

(چنڊن جو وڻ چوي مون ۾ ٻاونجاه گڻ آهن، منهنجي پٿر سان محبت آهي،  
هوا لڳڻ سان پٿر سان لڳي لڳي آئون گسجان پر پٿر نه گسجي، پلائي جي  
اها ڪهڙي ريت آهي.)

چنڊڻ ڪا چٽڪا پلا، اور لڪڙن ڪا پارا،  
چتر ڪي گهڙي پلي، مورڪ ڪا جمارا.  
(چنڊن جي ڪاٺي جو ڌڙو پلو، ٻين ڪاٺين جو اجايو بار، دانا، ماڻهو سان  
گهاريل هڪ ٻل به هلي، مورڪ سان پوري عمر به اجائي.)  
هنسا تون ڪين آڻڻ ڏومشو، ڪين اونڌي چونج جهڪا،  
ڪا تانهانجي جوڙي پڪري، ڪا سرمڙ سڪا.  
(اي هنس! تون ڇو اداس آهين، ڇو اونڌي چُهنب جهڪائي اٿي، يا ته  
تنهنجي جوڙي ٽٽي آهي، يا وري سمنڊ سڪو آهي.)

نڪو مانهانجي جوڙي پڪري، نڪو سرمڙ سڪا،  
اڻڄاڻ سين پريت لڳي، اس ڪا سوچ لڳا.  
(نه ئي منهنجي جوڙي ٽٽي آهي، نه ئي سمنڊ سڪو آهي، اڻ ڄاڻ سان  
محبت ڪير انهيءَ جو سوچ لڳي آهي.)

هنسا سرمڙ نه چوڙيش، سرمڙ ڪڙو ٿو هو،  
چيلر چيلر، پٽڪڻ سين، ٻٽان پلو نه ڪه ڪو.

(اي هنس! سمنڊ نه ڇڏجان، پلين سمنڊ باڙو هجي، ڏهن ٻر منهن هڻڻ ۽  
ڀٽڪڻ سبب تو تي ڪير به ڀلو نه چوندئي)

هنسا نان سِرمر گهڻا، پوپ گهڻي ڀمريس،  
سگهڙان نان ساجن گهڻا، ديس توڙي پرديس.

(هنس پکين لاءِ سمنڊ گهڻا، پونرن لاءِ گل گهڻا، سگهڙن لاءِ سڄڻ گهڻا، اُهي  
چاهي ديس ٻر هجن چاهي پرديس ٻر.)

ڪنتا رک ڪرڪو، هرڻ ڪيسا گيه ڪاءِ،  
اڪ ٻٽيڙو، لوٽان جهڙو ٿريان اگر جاءِ.

(اي منهنجا ڪانڌا! همت ڪر، ڏس نه هرڻ ڪهڙو تو نج گيه ڪائي، اڪ  
ڪائيندو آهي ۽ لوڻ (اُنهاري جي گر موسر) پيئندو آهي.)

### ڳوڙها

(نوٽ: ڳوڙهو هڪ مشڪل منظوم صنف آهي، جنهن جي هر هڪ لفظ جو  
اونهو پس منظر آهي، ڳوڙهن جي لفظي ترجمو ڪرڻ مشڪل آهي. ڊيگهه  
کان بچندي، اهي ڳوڙها بنا ترجمي جي انهيءَ مقصد لاءِ شامل ڪجن ٿا ته،  
انهن ڳوڙهن جي ٻولي ڍاٽڪي، ٺاهي بلڪه گجراتي، هندي، سنسڪرت،  
مارواڙي ۽ ڍاٽڪي سڀني ٻولين جو ميلاپ آهي.)

هر هرو ٿو ڀانڀڙي، هاري چتر سڃاڻ،  
پُر را باهيا موتي نڀجين، نيڻ ڪرين ليڏاڻ.

گهه ڳوڙهو ٻگ اوجرو، بهه گيندان ڪي ساڻ،  
ناري نان اونرلو، ڏينهن نه اتره رات.

ڳوڙهه رنگ رو گرامڻو، ٻريا موتو چاس،  
چڙهه سين پڇهه اتره نين، چٽ نين ٻارھ ماس.

ڏي سُت لي، ڪر پُر ڏريو، اپنه سُت ڪاج،  
ڪاسر سُت پُر گهٽيو، گهٽنت گهٽي جاءِ.



مانجهاري وک وکشو، سو وک ميري پاس،  
مير نربت سين جوجهو، ساسو کول کمار.

لٽکنت لونپ لٽار، اوران ري ذات،  
اپرو پتي چڏي، کيئون چلي اڌ رات.

پوم ست رپ بوليو، تو ست ڏني پٺ،  
سو سارنگ تل گرھيو، جڏھون آئي اٺ.

تلک نين چوٽو تين کو، رنگ پر زھي نين ريٺ،  
ماٿڪ لڙ چوٽي نين، اجان به کاجر نيٺ.

من ڪھ ري ميرھي چڙھان، پڳ ڏي پاوريان،  
رائه باگھه سين باتين کران، گر ڏي ٻانهيڙيان.

ڪڪڙيا تون کين ڪر گھايو، مانجهو گرتي رات،  
مانان لاگو ري تانان لاگهه، رائه باگھه تھو بيراگ.

آوو باگھجي بري، ڌک ڪاپ ڌوڌ، هارا،  
قول جاسين جهڙي، واس نين واگھجي.  
باگھه بنا سونو ڪوٽو، جائي ڏهاڱن نار،  
امل، ڪسونبو هونا ستا، تون گيو مولاوڻ هار.

ست سنگت سين ٻڌيا ٻڌه، جهاڙ اوڻ ڪي گھاس  
رجت سنگت منڍڪي ڪر، ٻڌيا ڪي ناس.  
سارنگ تر چوڌري، ڪھيو تھيتو ڏيس،  
سنڀت هئ تو گھر پلا، نين تانئين پلي پرديس.

سارنگ لي سارنگ ڪون چليو، سھو سارنگ ٿاھ،  
جي سارنگ نان سڌ ڏيان، تو مک رو سارنگ جاء.

سارنگ لي سارنگ ڪون چلي، پٺ مين سارنگ پرپور،  
اگ مين سارنگ هليئي، پان توڙي گھر دور.

..

## ڏٺوئا

ڏٺوئو ڏٺوئو بيڏ، سمجھو نان سالھ گھڙو،  
ڏٺوئو ڇڏاوءَ ڏيس، جوڳي ٿي جاو پٺ.

اڏٺوئو ڏھون علم آھي، سمجھدار ماڻھو لاءِ صالح آھي ۽ جيڪڏھن ڪو  
ڏٺوئو سمجھي ويو ته هو پنھنجو ديس ڇڏي جوڳين وانگر پيو پٽڪندو.

سوڪڻ سڪ ناھين اُڀجڻ ڪو.

پئسي واري ماڻوڪي سڪ ناھي ايندو، مگھڻار کان ڪنھن ڪم جي اميد  
نه هوندي، جيڪڏھن پاڻي ولوڙڻ مان مڪڻ حاصل ٿئي ته ڪير به رکي  
مانيءَ نه کائي.

پيسي ڏھڻ ٻڪري، پيڇي ڏھڻ اُٺ،  
جيڪو واڻ لڳڻ، اوڻ نان ڊڄڻ پٺ.

(ٻڪريءَ ويھي ڏوھجي، ڏاڇي کي بيھي ڏوھجي، جيڪو لڳي واھ تنھن  
کي ڏجي پٺ.)

پڙھڻ، ترڻ، تير هڻڻ، چوڻي گھوڙئو سواري،  
ننڍو هونئو سڪيو، تو واھ، نينٽائين پڇڻ اھڻ ڪواري.

(پڙھڻ، ترڻ، تير هڻڻ ۽ چوڻين گھوڙي سواريءَ ننڍپڻ ۾ سڪجي ته واھ نه  
ته پوءِ سڪڻ خواري آھي)

ڪرسان ڪر سان ڪم ٻگڙ سڻ، ڪڙھسان، ڪڙھسان ڏڏ ٻگڙ سڻ،  
پڙھاسان پڙھاسان پوٽ ٻگڙ سڻ، ڪڙسان ڪڙسان ڪيت ٻگڙ سڻ.  
نار ٻگڙ سڻ ٻر گھرسين.

(ڪنداسين ڪنداسين چوندو رهڻ پر ڪم نه ڪرڻ سان ڪم ٻگڙندو،  
ڪڙھنداسين ڪڙھنداسين چوندو رحڻ پر نه ڪڙھڻ سان ڪير ٻگڙندو،  
پڙھائينداسين پڙھائينداسين چوندو رهڻ پر نه پڙھائڻ سان پٺ ٻگھرندي،  
ڪيڙينداسين ڪيڙينداسين چوندو رهڻ پر نه ڪيڙڻ سان ڪيت ٻگڙندو، عورت  
ٻگڙندي پرائي گھر وڃڻ ڪري.)

ڏيئو ڀلوئيج ڏوڪڙو، ڀيو ڀلو نين لاک،  
ڪوڙو ڀلوئيج ڪوڪڻو، سڇي ڀلي نين ساک.

(ڪنهن کي هڪ رپيو ڏيڻ به ڀلو، پر لک روپيا وٺڻ به سٺو ناهي نڪ ۾  
وجهڻ وارو ڪوڪو به ڪوڙو ئي ڀلو پر ڪنهن جي ساڪ ڏيڻ ڀلي ناهي  
چاهي اها سچي چو نه هجي.)

بار هي ٻڌ نين آئي، تيرهي تيج نين ٿيو،  
پچيسي نه پڙيڙيو، تو اوڻه ري وات مٽي جو.

(بارهن سالن جي عمر تائين عقل نه آئي، تيرهن سالن تائين نور نه آيو،  
پنجويهن سالن جي عمر ۾ جذبو نه آيو، ته انهي ماڻهو جون راهون نه ڏس.)  
ٻولي چڪڙ ري ٻنڌ ڪونهين، مرمر ڪونهين من مين،  
ڇلو مٽي سنگ اوڻه رڻ، ڇڏسڻه پرها بن مين.

(جيڪو ماڻهو پنهنجي زبان تي قائم نه آهي، ۽ دل ۾ رحم نه آهي انهي  
سان گڏ نه هلو، هو ڪڏهن اوهان کي جهنگ ۾ (مشڪلاتن ۾) رولي  
ڇڏيندو.)

مورڪ مٽ اڃاڻ، سمجهايو، نين سمجهڻه،  
پاڻي منجهه پاڻ، پڄڻه تو هي نين پيڏڻه.

(مورڪ بي سمجهه اڃاڻ سمجهايو وڃي ته به نه سمجهي، پاڻي اندر ويٺو  
آهي، ٻئي ڀيرو، پر پاڻي جذب نه پيو ڪري.)  
نو نيجا پاڻي ڇڙهڻه، پٿر سين پيڏڻه ڪور،  
سنگت بچاري ڪيا ڪرڻه، جيرا رڏا پيا ڪنور.

(نو نيزا پاڻي ڇڙهي وڃي ۽ پٿر وانگر فرو به پاڻي جذب نه ڪري، انهي ۾  
سنگت ويچاري ڇا ڪري؟ جنهنجو من پٿر هجي.)  
بارهي گائوئي، ٻولي پلڻه، پنڃي پلڻه وڻ راه،  
رُت آوي، ساڪان پلڻن، لڄ نين پلڻن لاکي.

(بارنهن ڪوهن ٻولي بدلجي، پکي بدلجن وڻ راه جي بدلڻ سان موسر  
اچڻ تي ساڪون (شاهديون) بدلجن پر لاکيڻ ماڻهن جا لڄڻ نه بدلجن.)  
سُڻيا سُهِي پر سمنڊا ناهين، مٽيا نهين من ڪا موھ،  
پارس لڳ پُهتا، پر رهيا لوھ ڪا لوھ.

(بتو ته سهي پر سمجهڻين نه دل جو دلدل نه مٽيو، پارس تائين پڳا پر رهيا  
لوھ جا لوھ)

پارس پُڻسڻه پار، سو مڻ لوھ ڪنڄن ڪرڻه،



(پارس پشي کان وڌيڪ اهم آهي. جو سؤ من لوه جا سونا ڪري ڇڏي).  
پارس رُءُ ڀرتاب، سين، ڪنڇن پئي تلور.  
تين ئي مٿيا ناهين: ڪار، ڌار، اهنڪار.

(پارس جي تابسان تلوار سون ته ٿي وئي، پر انهيءَ جا ٿي بدليڃڻ، ڪار، ڌار  
۽ اهنڪار نه مٿيا).

مارها تو من ڪي پلي، اور ڪا ڪا پارا،  
جي مارها مين گڻ هءُ، توڪيا، بيچءُ مٿيارا.

(تسيع ته من جي پلي باقي ڪاڻ جو وزن آهي، جيڪڏهن تسيع ۾ گڻ  
هجن ها ته پوءِ مٿيارو ڇو وڪڻي ها).

مارها تو ڪاڻ ڪي پلي، جءُ وچ هي سوت،  
مارها مين توگڻ بهت، ڦيرڻ وارا ڪپوت.

(تسيع ته ڪاڻ جي پلي جنهن جي وچ ۾ سٺ، تسيع ۾ ته گڻ گهڻا آهن،  
پر ڦيرڻ وارو ڪپوت آهي).

ڪُونڀو پاڳو ڪاڇ ڪو، من پاڳو ويڻ ڪُوڻڀ.  
موتي پاڳو بينڌ ته سندن نين لاڳهه سيڻ.

(ڌڪ لڳڻ سان شيشي جو ٽٽڻ، گڻي لفظ سان من جو ٽٽڻ، سوراخ ڪندي  
موتي جو ٽٽڻ 7 دوست جي وڇڙڻ وغيره ڪي جوڙ نه لڳي سگهندو).  
(من، موتي، شيشو ۽ ٿانءُ ٽٽڻ کان پوءِ جڙي نٿا سگهن، گوري اڳيان  
محبوب گذري پيو وڃي ڄڻ واٽهڙو پيو وڃي، انهن سڀني ڳالهين جو  
پهريون ڌيان رکجي).

ٿي ساڄا موتي سڀ ڪا، مي چان هير ڪڍي،  
ٿي ٿارو من ڪاڻو ڪرو، مارو چءُ رام ڌڻي.

(تون سڀ جو سڄو موتي آهين، آئون ته واري جي ڪڍي آهيان، تون  
پنهنجو من مضبوط ڪر باقي منهنجو خدا مالڪ آهي).

پُون پُون مَت ڪَر پُڻري، ٿانرو مدگر مُونو نين ڄاڻ،  
بانڌا اوڻي چوڻسين، اڳهه ري پاڻ.

(پُون پُون نه ڪر پُونري تنهنجو محبوب مئل نه ڄاڻ، جيئن صبح جو سج  
نڪرندو هو آزاد ٿي تو سان ملندو).

چنٽيا سين چٽرائي گهٽه، ڏک سين گهٽه سرير،  
پاپ سين لڇمي گهٽه، ڪهي گيا داس ڪبير.

(پريشاني ڪرڻ سان عقل گهٽجي، ڏک ملڻ سان ماڻهو جسماني ڪمزور  
ٿئي گناه ڪرڻ سان پئسو گهٽجي چئي ويو ڪبير داس.  
ست سنگت هر پگت، ڪپوئي نين نرقر هو،  
چنڊڻ پاس روڪڙا، سويي چنڊڻ.

(سچي دوستي، خدا جي عبادت ڪڏهن به بي ڦل ناهن هوندا، چندن وڻ جي  
ويجهو بيٺل بيا به وڻ چندن ٿي ويندا آهن.)

چنڊڻ اڳو بنباس، رونڪي ٻڌي آس،  
بنس اڳو بنباس، تڏهين ٽرڪڻ لاڳي بنباس،  
پهيل اُچارڻ ڪر، آڀرو، پيچي ساري بنباس.

(جڏهن جهنگ ۾ چندن جو وڻ پيدا ٿيو ته بين عام ٻوٽن ۽ وڻن ۾ هڪ آس  
پيدا ٿي، جڏهن بانس جو وڻ پيدا ٿيو، جڏهن سچي جهنگ ٿرڻو مچي ويو،  
ڇاڪاڻ ته پهرين پنهنجو نسل سارين پوءِ ٻي سچي جهنگ.)  
ڇوڪي پرينت چڪور ڪي، چاندا نهين مانڻ،  
اس ڪي او جائڻ، اڀي توڙي نپانا.

(سچي محبت چڪور جي چنڊ نه مڃي، هن جي هو ڄاڻي هن کي هميشه  
توڙ نپاڻي آهي.)

گڻ اوگڻ ري گر نهين، نهين نڱري مين نيا،  
گر ڪر هيڪ ڀا، روهي پلي راجيا.

(گڻ ۽ اوگڻ جي ڪابه تميز ناهي نه ٿي نڱري ۾ انصاف آهي. ڳڙ ۽ ڪڙ هڪ  
قيمت تي، انهيءَ کان جهنگ پلي راجيا.)

من مَرُ مايا مَرُ، مَر مَر جائڻ سرير،  
آسا تينا ڏوئي ماري، نانڪ پيو ڦڪير.

ڏرو پيو، پهلج پيو، پيو زوي داس، ڪبير سنه ايسو پيو، اڃان  
پيو ري آس.

(ڌارو پيو، پهلج پيو، روي داس به پيو پر ڪبير داس اهڙو پيو جو  
اڃا پيو جي آس رهجي آئي.)

نام ڪبير، جات جلاهو، ڪانسي را مين واسي.

(نالو ڪبير، ذات جلاهو ڪانسي جو آئون رهندڙ.)  
ڪبير ڪٿا نين ڌارڻ، ڏوٽ وارين ڏک،  
ڪاوڙيا جڏهن ڪر ڏسڻ، ريڌا چٽ ڪ.

(ڪبير ڪٿو نه ڌارجي ٻنهي ڳالهين ڏک ڪاوڙندو ته چڪ هڻندونهندو ته  
مون چٽندو.)

انيتي سين راج گيو، ڪورٽب گيا ڪنس،  
انيتي سين راڻو راڻو گيو، تيج گيو بنس.

(ناننصف سان حڪومت وٺي ڪنس پڻ سڄي ڪمائي وٺي ناننصف سان  
راڻو راڻو تباه ٿيو ۽ چمڪ وٺي بانس جي.)

پر ناري ري پريٽڙي، پنج پرڪارن ڪاء،  
ڏن هارڻ، جوپن گهٽ، اڀران ري پريت جاء،  
جيٽ ڪاڻ ڪارجو، مٺ نرڪ لي جاء.

(پراڻي ماڻي جي محبت پنج شيون تباه ڪري؛ ملڪيت، جواني، پنهنجن  
جي محبت، جيسين جيئرو هوندو تيسين رت پيئندي، ۽ مرڻ پڄاڻان نرگ  
(دوزخ) ۾ وٺي وڃي.)



## شاعريء جو رومانس

ادب جون تخليقي صنفون ته شاعري، ڪهاڻي ۽ ناول ٽي شمارجن ٿيون پر ناٽڪ، سفرنامو، آٽر ڪٿا، خاڪه نويسي، تحقيق، تنقيد، ۽ ڪالر نويسي به ادبي ڪاوشون آهن. ڪالر نويسي، تحقيق ۽ تنقيد کي ثانوي ادب چيو وڃي ٿو، جيتوڻيڪ اهو مرتب ڪيل هي ادب سهيڙ، سڌار ۽ اوڪ ڊوڪ جي مرحلن مان گذري عمدو ۽ اثرائتو گهاڙيٽو اختياري ٿو، پر ان سڀ اسٽرڪچر جي تخليقي انفراسٽرڪچر تي بيٺل هوندو آهي. دليل، نقطي نظر ۽ فڪري سٽاء جي اپٽار شعوري هجڻ سبب خارجيت جون گهرجون ته پوريون ڪن ٿيون پر منجهن جذبي ۽ احساس جو فقدان رهي ٿو. جذبي ۽ احساس جي جانبداران، آزادانه ۽ جمالياتي اپٽار داخليت جي نت نئين وادين جو سٽر ڪرائي ٿي. اهوئي سبب آهي جو ادب جو ڳاڻيٽو داخليت ۾ ٿئي ٿو.

سنڌي شاعري جون ٻوليءَ جيان پاڙون گهڻيون پڪيون ۽ پختيون هونديون آهن. ڪيتري به حالتن جي ڦير گهير آئي، شاهي محل ماڙيون ڊهي پٽ ٿي ويون پر سنڌي ٻولي ۽ شاعري جون ڏيائون جلي ۽ جرڪي رهيون آهن. اها ساهن ۾ سانڍيل مٽي جي مهڪ آهي، جياپي جي ضمانت سنڌو جل آهي، انڊس ويلي جي تهذيب ۽ خوشحالي جو رومانس آهي جنهن جي آبياري شاعر رضاڪاران طور ڪندارهن ٿا. جيئن بڙ، يا پير جون پاڙون اونهيون ۽ گهڻيون پڪڙيل ٿين ٿيون جنهن ڪري ٻيو ڪو وڏ انهن ويجهو اسري نه ٿو سگهي، تيئن شاعري جي چيڪي مٽي احساس جي پاڻي ۾ اهڙي ته ڳوهيل آهي جو مٿس انيڪ ٻولين جو اثر پيو تڏهن به منفرد مزاج کي برقرار رکيو. هيءَ انفراديت ئي شاعري جو رومانس آهي جيڪو ادب ۽ آرٽ جي بچاءَ ۽ ڦهلاءَ ۽ ڦلار ۾ ڪردار ادا ڪري ٿو.

ابلاغ جي ڊجيٽل ذريعن جي مقداري ۽ معياري واڌ ويجهه سان



شاعري جي ڦهلاءَ کي به وڏي هٿي ملي آهي. هونئن شاعري ڪنهن مخزن. اخبار ۽ ڪتاب ۾ جڏهن شايع ٿئي، انتظار ڪرڻو پئي ٿو پر سوشل ميڊيا تي شاعري (ڪچي، پڪي) اپ لوڊ ڪري فوري فيڊ بئڪ ورتو وڃي ٿو. هن وقت عام توڻي خاص ماڻهو فيس بوڪ تي ويهي ٿو. ان ڪري شاعر جي ڪلام جي پذيرائي به سرحدي بندشن کان ماورا دنيا جي ڪنڊ ڪڙڇ ۾ ٿئي ٿي. اشاعت ذات جو رومانس تخليقڪار کي متحرڪ ۽ فعال رکي ٿو. جهٽ گهڙي، ۾ رابطو، ماضيءَ ۾ ممڪن هونءِ اهو ڏند ڪٿائن جي اهڃاڻي ڪردارن سان منسوب هو. داستانن ۾ ڪردار گهڙي، گهريل نتيجا پئي ڪڍيا ويا، ماورائي سهي، پر تخليقي هئا. سو تخليق ايتري اڳاڻي آهي، جيترو اڳاڻو خود انسان آهي. هيءُ انساني ذهانت آهي، جنهن کي ڪتب آڻيندي، انسان هڪ ڪائنات اندر ڪئين نئون ڪائناتون جوڙي ورتيون. طبيعات جا اصول دريافت ڪيائين، نت نئين ٽيڪنالاجي ذريعي پيداوار سان بازارون سڃائي ڇڏيائين. سوشل ميڊيا ايڪيهين صدي جي آن لائن بازار آهي.

اوائل ۾ شاعري جي سڪو زباني ڪلامي روايت (Oral Tradition) وارو چالو هو، هن وقت شعر لکجي ٿو. شاعر لکڻ سان گڏ ڪمپيوٽر تي ٽائپ به ڪري ٿو. هي ضمني پورهيو به شعر کي ٺاهڻ (Making)، هيٺ ڏيڻ (Shaping) ۽ اُٿڻ/سنوار سڌار (Treatment) جو ضمني پورهيو به شاعر ڪري ٿو.

انٽرنيٽ هڪ روشنڊان آهي. منجهانئس روشني اچي ٿي، هوا اچي ٿي ته احساس جي سوڙهه ختم ٿئي ٿي. ڪٿي به هجي، انسان ساري دنيا جي انسانن سان جڙي وڃي ٿو. اهو جوڙڻ جو ڪم اديب، شاعر، آرٽسٽ، عالم ڪري رهيو آهي. نيٽ جو روشنڊان ڪشادو آهي. ڪڏهن اتر لڳي ٿو، ڪڏهن ڏکڻ! جو روشنڊان جي ٻن پاسن مان، هڪ ٿڌن علائقن ڏانهن کلي ٿو، ٻيو گرم علائقن ڏانهن. سائبريا ۽ اسڪا جهڙن اتر قطب جي ويجهو انهن هنڌن کي ڏسڻ جو موقعو ملي ٿو، جتان جي جاگرافيائي بيهڪ سبب ڪن مهينن تائين، سڄي نه ٿو اڀري. اتان جي هوا مان هڳاءُ ملي ٿو. هي سائنس جي بدولت ئي هڪ هنڌ ويهي دنيا جون رونقون ڏسي سگهجن ٿيون. سائنس شعور آهي، شعور ۾ دليل آهي، دليل ۾ آفاقي سچائي آهي، پر سچائي شاعريءَ ۾ به آهي. سائنس جي سچائي ثابت ٿي چڪي تڏهن دريافت جي شڪل ۾ آڏو آئي، البت شاعريءَ ۾ سچائيءَ جي ڳولا لاشعور

ذريعي ٿئي ٿي. سڃاڻي جيڪا اڃا دريافت نه ٿي هجي. ادب ۾ ٻئي شيون ملن ٿيون. شعور وارو دليل آهي ته لاشعور وارو جذبو به آهي. ادراڪ جي تڪميل ۾ ٻئي عنصر گهرجن، جو انساني دماغ جي ساخت اهڙي آهي. چئبو ته هم گيريت جي تقاضا اها آهي ته سڀ شيون گڏ گڏ ڪشي هلجن. شاعري جي انڊلٽ ۾ سڀئي رنگ ملن ٿا. سڀئي رنگ ملي جڏهن باغ جيان هڪ وحدت جونماءُ ڪن ٿا ته اهو نماءُ خارجيت ۾ ثقافتي قوت (Cultural Force) ۽ داخليت ۾ قوت حيات (Vitality) جو روپ ڌارين ٿا. اچو ته هاڻي شاعري جا گوناگون رنگ ڏسون! احمد سولنگي جو شعر آهي ته:

مجنوب جي پيرن جي پازيب ٿيان آئون،  
درويش! نگاهن سان هڪ وار نهاري ڇڏ.

پهرئين سٽ، ”مجنوب جي پيرن جي پازيب ٿيان آئون“ ۾ خواهش (urge) اڀري ٿي ته ٻي سٽ خواهش جي تڪميل آهي. ڪڏهن هڪ سٽ به پرپور معنيٰ ڏيندي آهي. هي شعر ڏسو ته:

تخليق ۽ خالق ۾ تفریق نه آ ڪاڻي،  
هي پانڌ پناهين جو جسمن تان اتاري ڇڏ.

مصرع اوليٰ، ”تخليق ۽ خالق ۾ تفریق نه آ ڪاڻي“ معنيٰ جي تشنگي پوري ٿي وڃي ٿي، مصرع الثاني محض تفصيل اٿس.

شعر ۾ جدت نئين حسيت سان اڀري ٿي. جيئن سج اڀري ٿو ته باڪ مان تازگي، جو احساس جنم وٺي ٿو. رات جي اوندھ ختم ٿئي ٿي، ننڊ جاڳ ۾ بدلجي ٿي. پکي لون ٿا، مڪڙيون ٽڙن ٿيون، پونئر گلن مان واس وٺن ٿا. چوڌاري چهچتو ڏسي دل باغ باغ ٿئي ٿي. وايو منڊل ٿي بدلجي وڃي ٿو. نئين حسيت جي شاعرا روپنه اڀري جو تخيل آهي ته:

وري مڦتلن مان اُٿيو هُل آ،  
نئون سنڌ ۾ ڪو ٽڙيو گُل آ-  
ڪشي نيٺ ڏسُ ڪيڏي ڦلواڙي آ،  
وٿيو توکي هڪڙو ئي چو ڦل آ؟  
خدا پي هيو حيرتن ۾ ٻڌل،  
هي ڪهڙي بشر جي نئين پُل آ-

شاعريءَ جي جماليات جو هڪ عنصر حسن تضاد آهي. تضاد ۾ لڪل سڃاڻيءَ تان پردو ڪڍي ٿو. آثر ناٿن شاهي جا هيٺيان ٻه شعر ذڪر

ڪيل خوبيءَ وارا آهن:

هر هڪ ڪاريءَ رات جي ڪڪ مان،  
بشجي باڪ اُڀرندو آهيان.  
ڏاڍن کان ڏُر ناهي ٿيندو،  
ڏهرن کان مان ڏرندو آهيان!

پل، قافيا مانوس هجن، پر اُٿت ۾ لفظ لفظ سان نهڪي ته سوچڻ تي مجبور ڪندو. تجنيس مان موسيقيت اُڀري ته تجربو آڙندو. اياز گل جو غزل ٿا چڙهون، جنهن ۾ هر آواز اکرن ۽ هر قافيه لفظن جي تڪرار مان موسيقيت کي اپاريو اٿس:

سوچون ساريون هارايل سردارن جيان،  
خواب پيا ها پيرن ۾، تلوارن جيان.  
کلندا، روئندا، ٻُڌندا، ڪجهه چوندا به نيٺ،  
چو سمجهو ٿا ماڻهن کي، ديوارن جيان.  
جيون جي هن موت سمان خاموشيءَ ۾،  
تنهنجا نرميل نيٺ لڳن ٿا نعرن جيان.  
ڏک جي ڪاري رات هئي چوڌاري ۽،  
تنهنجا منهنجا لڙڪ ٿي ٽمڪيا تارن جيان.  
رات سڄي مان جاڳي ڏينهن ڪندو آهيان،  
جڏهن به لڳندي آهين، دنيا وارن جيان.

طبيعت موزون هجي ته شعر سولائيءَ سان نهجي ٿو. آمد چئون، يا آورد، آهي ارادي جو ڦل! رعب وجهڻ لاءِ، يا گهٽائيءَ جي ويساهه مطابق فني صلاحيت کي غيبي قوت چوندا آهيون. جڏهن ته موزونيت، پرپور ڪيفيت ڇانئجڻ آهي. اها ڪيفيت ڪل وقتي به ٿئي ٿي، جزوي به. يعني، ڪيفيت ڪڏهن جهڙ ڦڙ وانگر، ڪڏهن سانوڻ جيان رهي ٿي. اسلو ٻڌائيندو ته هڪ ئي ڪيفيت ۾ شعر چيل آهي، يا الڳ الڳ ڪيفيتن ۾. ازخود ڪيفيت نه هوندي ته شعر فطري سونهن کان وانجهيل لڳندو. وزن جي گهرج ڀرتي لفظن سان به پوري ٿيندي، پر ان ۾ لٽي نه هوندي. غلام نبي گل (برڙو) جا هي شعر ڏسو، ته ڪيئن لفظ لفظ سان نهڪي ٿو:

هرڪو پنهنجو پتو پيو ڳولي  
زندگي راند چڻ رمي آهي

ٿوري احساس جي تپش گهرجي  
برف سينن تي وٺي ڄمي آهي.

”زندگي راند ڄڻ رمي آهي.“ ”برف سينن تي وٺي ڄمي آهي“ ۾  
نئين حسيت ملي ٿي، رڄاءُ به فنڪاراڻو اٿس. فنڪاراڻو اظهار، ذات جو ئي  
اولڙو نه، پر منجهس ماڻهپي جي هم گيريت هوندي آهي، تڏهن ته هر  
مڪتب فڪر وارو قاري شعر ما حظ وٺي سگهندو. ڪن نقادن جو خيال  
آهي ته غزل جڏهن ٻڌي واه واه ۽ آه آه از خود زبان تي اچي ته غزل  
ڪامياب چئبو. ٻڌندڙ کي ڪورونا هجي ته هو غالب لاءِ به چوندو، ”غزل  
ايشن سهي لکيو آهي.“ معنيٰ، غزل کيس ئي لکڻ اچي ٿو. اها نرگسيت  
چئجي، يا ٻيو ڪجهه! جيڪڏهن مير تقى مير جي لفظن ۾ چئي ته:

مستند ۽ ميرا فرمايا هئا

علامه اقبال ته پاڙ تائين پهچي ٿو ته:

تيري تبير ۾ مفرتم ۾ اک صورت ٿرالي کي

غلام نبي گل ٻرڙي جي لفظن ۾ ته:

ڪٿي مون ڳالهه لک جي آ

نه تو سمجهي ته ڪڪ جي آ

گل صاحب ڪهاڻيون لکيون، ناول لکيا، اردو شاعري به ڪئي،  
اردو شعري مجموعو ڇپيل اٿس. تجربا گهڻا ڪيائين، پر بنيادي طور شاعر  
آهي. سائين جو پٽ اعجاز ٻرڙو منهنجو مهران يونيورسٽي، ۾ ڪلاس  
فيلو هو. هو اڃا پاڪستان اسٽيل ۾ آهي، مان ڇڏي آيس. هن گهڻو لکيو،  
سنو لکيو. جميعت الشعرا جو ميمبر رهيو ته سنڌي ادبي سنگت شاخ قنبر  
سان به لاڳاپيل هو. اياز جاني سنگت ۾ فڪر ۾ ترقي پسندي، سان  
سلسلاڙجي ويو. اياز جاني سان منهنجي ملاقات اعجاز ٻرڙي جي معرفت  
ٿي.

غزل جون ڪي فني گهرجون آهن، جيڪي پوريون ڪرڻيون پون  
ٿيون. اهو هڪ صنف سانچو آهي. وائي، ڪافي، نظم، گيت، هائيڪو  
مختلف صنفن جا سانچا آهن. رقص جا جيئن قسم آهن، راڳ جا سر آهن.  
چوڻ ۾ رقص - رقص آهي، راڳ - راڳ آهي. سانچي اندر رهندي فڪري



گهرجون پوريون ڪرڻيون پونديون. نظر ۾ نثري نظر ۽ آزاد نظر جو صنفِي تجربو اٿڻي ٿو، غزل ۾ نه. جڏهن ته فڪر ”تغزل“ جي چاشني آهي. تغزل جي معاملي ۾ تجربا مختلف ملن ٿا. اهو ارتقائي سفر آهي جنهن جي منزل به سفر آهي، پر مسلسل. گهڻا عنصر آهن، جهڙوڪ وقت، هنڌ ۽ شاعراتو مزاج، مشق سفر جا سونهان آهن. ان ڪري ڏسنداسين ته شيخ اياز جهڙي مڃيل شاعر جي غزل جا اسلوبِي رنگ گهڻا نظر ايندا. صحبت بلوچ جو غزليه رنگ ساڳيو ئي آهي. کيس اڃا ارتقا جا مرحلا طئه ڪرڻا پوندا. هي به، ته غزل ۾ هر شعر الڳ معنيٰ ۽ مفهوم ۾ چئي سگهجي ٿو، پر ڪيفيتي انداز ۾. هڪ ڪيفيت ۾ جيئن غزالا، يعني هرڻي جنهن تان غزل تي نالو پيو، ٽپ ڏيندي آهي ته وڪ ٽڪي، ڀري، گهٽ وڌ اونچائي جي آئوٽ لائين ڊوڙ جي ڪيفيت چٽبي. خوف مان پڇڻو پئيس، ته وڌ ۾ وڌ رفتار سان ڊڪندي، جو جان بچائڻ لاءِ آخري حدون اورانگهي ويندي. ڪيفيت اها به آهي، آخري حد اورانگهڻ واري! صحبت جي غزل جو بند بند جدا خيال جو اظهار آچي ٿو. حالانڪ مسلسل غزل ۾ وحدت اثر زبرو ٿئي ٿو. ان ڪري ته ڪيفيت جي هڪ ئي ٽڪريءَ تي چڙهندي چڙهندي، چوٽي سر ڪرڻ جو موقعو ملي ٿو، بجاءِ ڪڏهن هڪ ٽڪريءَ ته ڪڏهن ٻئي تي. هڪ ٽڪري جي صورت ۾ رڳو چڙهڻو پئي ٿو، هيڏي ڪڏهن ٽڪري تي چڙهڻو، ڪڏهن لهڻو پئي ٿو. ڪيفيت جي اُچار ۾ چڙهڻا اُتار (ascending/ descending) ۾ لهڻو تنهن کي پوندو جنهن چڙهي چڙهي چوٽي سر ڪئي هجي. صحبت بلوچ سميت اسان جهڙن اڀرندڙ شاعرن کي چڙهڻو ئي چڙهڻو آهي. چڙهڻ ئي چڙهڻ ۾ ساڻي پئي سگهجي ٿي پر بيهي رهڻو ناهي. غزل مسلسل لکڻو پئي ٿو، جيئن ڪيفيت سپاءِ بڻجي پئي. دادوءَ جي پياري دوست بلوچ صحبت علي جو هڪ غزل تڪ تور لاءِ مليو آهي. بلوچ صحبت رسمي تعارف جو محتاج ڪونهي. دادو ۾ وڪالت ڪري ٿو. سڪيو ستابو آهي. هو وڪالتي ڪتاب ته پروفیشنل گهرج آهر پڙهي ٿو، پر دل جي ڌڪ ڌڪ جي لئي شاعراڻي اٿس. ان ڪري شعرگوئي وندر اٿس ته ضمير جي آواز کي لفظاڻو روپ ڏيڻ به. نثر جو شنو ليکڪ آهي. نثري ڪتاب مارڪيٽ ۾ موجود آهن. سرچ ڪجن ته نيٺ تي پڙهي سگهجن ٿا. وقتن بوقت شاعري فیس بوڪ تي دوستن سان شيئر ڪندو آهي. ساڻس دوستيءَ جو مک حوالو ادبي رفاقت آهي. سنڌي ادبي سنگت ڪراچي شاخ جو به ٽي پيرا سيڪريٽري رهيو، اهو نه وسرندو ته پنهنجي سيڪريٽري شپ دوران ادبي تنقيد جي موضوع تي نامياري نقاد

اڪبر لغاري کان شاندار ليڪچر ڪرايو هو. پهريون مشاعرن، ڪانفرنسن ۽ تنقيدي ويهڪن جون پيرائتيون رپورٽون ڇپيون هيون. اها ادبي تاريخ آهي، جيڪا ڇڄڻ سبب ئي لائبريريءَ جي زينت بڻجي ٿي. شاگرد، محقق، اڀرندڙ شاعر، اديب لاءِ ڇپيل مواد دستاويزي حيثيت رکي ٿو. سو بلوچ صحبت جي شخص مان شخصيت بڻجڻ ۾ ته ڀل! پروفيسرن جو دخل ڪليندي هجي، پر اسان لاءِ سندس ادبي سڃاڻپ مقدم آهي. هن جو غزل ٿا پڙهو:

غزل جو ذڪر ته ٿيو، اچو ته پڙهون:

زمانِي جا ڄڻ هُو خدا ٿي ويا هِن،  
اڪيلو ڪري هُو، جُدا ٿي ويا هِن.  
نه احساس هِن کي ٽڪي جو ٿيو هو.  
اسان لاءِ لمحا سزا ٿي ويا هِن.  
پلا ڪنهن کي روئي ٻڌايون ڪهاڻي،  
وهي نير توتان فدا ٿي ويا هِن.  
نه گل ڪوئي لائي هي ڳوڙهان ڪو اڳهندو،  
وڌي جوش جذبا صدا ٿي ويا هِن.  
اسان بس نماز آ پڙهي نينهن جي ۽،  
حقيقي هي سجدا قضا ٿي ويا هِن.  
اص ڌرتي اوهان جا ئي مقروض آهيون،  
پلي حق ٻين جا ادا ٿي ويا هِن.

سنڌ جي سياح الطاف شيخ جو ليک، بعنوان: ”تخلص وارا ڪجهه اسانجا شاعر“ پڙهيم ته:

”اهو به ضروري ناهي ته هر شاعر لاءِ تخلص ضروري آهي. تاج بلوچ، تنوير عباسي، نعيم دريشاڻي، ريٽا شهاڻي، نند جوڀري، امداد حسيني، شمشير الحيدري، عنايت بلوچ ۽ هدايت بلوچ جهڙا ڪيترائي وڏا شاعر آهن، پر هنن جو ڪوبه تخلص ناهي، پر ڪي صحبت بلوچ وانگر پاڻ کي اڪيلو، مسافر، راهي ويندي سنڌي، فدا، پرديسي (بلاول)، پياسي (پيرل)، مسڪين (جهان خان ڪوسو)، هالاڻي (انور، سوز)، مورائي (راشد، بشير) سڏائين ٿا... الخ“

الطاف شيخ بلوچ صحبت علي کي ”صحبت بلوچ“ لکيو آهي. تاج بلوچ، عنايت بلوچ، سميع بلوچ، هدايت بلوچ، بيخود بلوچ، ٻيا شاعر نالي ۽ سندن قوميت سان مشهور آهن، هُون ذاتيون الڳ الڳ اٿن. هي ”بلوچ“

سڀئي نالي پٺيان لکندا آهن، ۽ صحبت صاحب نالي کان پهريون لکندو آهي. بلوچ صحبت علي واري سڃاڻپ کي ڇپيل ڪتابن ۾ برقرار رکيو اٿس. شاعري ۾ جدا نالو بطور تخلص به لکجي ٿو. جيئن شاعريءَ ۾ ”صدا لاشاري“، انثري ڪاوشن ۾ ”اي بي لاشاري“، يا شاعر ”سقراط سيتائي“، صحافي ”شبير سومرو“. شاعراڻو نالو صحبت بلوچ لکڻ کپيس. ان ڪري ته شاعراڻو نالو مختصر ئي رکجي ته ڀلو!

روايت تسلسل آهي جيڪو ماضيءَ کان منتقل ٿيندو حال تائين پهچي ٿو. جدت انهيءَ تسلسل جي تڪميل ڪري ٿي. سج ساڳيو، ايامن کان اڀري ٿو، آلهي ٿو. آلهي، يعني ظاهر ۾ لهي ٿو، پر لهي نٿو، اڪثرين کان اوجھل ٿئي ٿو. شفق جي عالم ۾ سانجھ اداسي جا رنگ چٽي ٿي. اوندھ ڇانئجي ٿي، ته من به اداسيءَ جو اجرڪ اوڍي ٿو. پھر پھر جي ڪيفيت الڳ الڳ احساس اڀاري ٿي. سانجھ، انڌيرو، باڪ، لاٽ جا لقاءَ روز ساڳيون ڪيفيون اڀارين ٿا ته نيون ڪيفيتون به طاري ڪن ٿا. غزل جو بند بند، نئون احساس آڇي ٿو. نديون، سمنڊ، ڍنڍون، پهاڙ، گلشن ۽ رڻ پٽ ساڳيا آهن، کين عمر جي الڳ الڳ پيئي ۾ ڏسبو ته نئون احساس جاڳي پوندو. فڪر سان به لاڳو آهي.

هتي ڪجهه شعري اسمن تي تنقيدي راءِ ڏجي ٿي. گوهر شيخ جو غزل آهي:

هتي ئي پرين، پاڻ ڏيري وڃين هان،  
 نئين درد جي تون نه ڏيري وڃين هان.  
 اسانجي ڪنڊن سان ڪرين هان گذارو،  
 پراون گلن جي نه پيري وڃين هان.  
 وڇوڙي مهل ماڻ هوندي مرڪ آ،  
 وضاحت نه آڏو وڪيري وڃين هان.  
 رڳو چيڙهه هاڻي چڱون ٿو چٻاڙي،  
 هڻي ميٽ، هڪڙي ته پيري وڃين هان.  
 اسان سيند جا هون ڪڏهن کان سوالي،  
 ڦٽي ڪا اسان تي به ڦيري وڃين هان.

مطلع جي مصرع ٻانهي: ”نئين درد جي تون نه ڏيري وڃين هان“ ۾ تلميح (ڪنايو/ اشارو) ڪتب آندو اٿس. نئين درد جو ”ديرو“ اشارو ڪري ٿو ”نئون ديرو“ نالي شهر ڏانهن. رمز ۾ گهمائي ڦيرائي ڳالهه ڪبي آهي. اهو فن غير معمولي صلاحيت وارو نڀائي سگهي ٿو. ذڪر ڪيل سٽ ۾ رمزيه



ڪلام جي سونهن خود ڳالهائي رهي آهي.  
پڇاڙڪي بند ۾ جماليات جي عالمانه (academic) وصف ملي ٿي.  
شعر هن ريت آهي ته:

اسان سيند جا هون ڪڏهن کان سوالي،  
قشي ڪا اسان تي به ڦيري وڃين هان.

قشي ڏيڻ سان بي ترتيب وارن کي ترتيب ۾ آڻيو آهي. ان ڪري ته  
”ار سهڻا لڳن. وارن مان سونهن جي شاهدي ملندي آهي.“ بي ترتيب مان  
ترتيب ۾ اچڻ سان جماليات جنم وٺي ٿي. ”لوھ کي مقناطيسي بڻائجي ته  
لوھ ۾ لوھ ڏانهن ڪشش پيدا ٿيندي. گوهر شيخ پنهنجي شعر ۾ ڪشش  
کي اپارڻ ۾ سويارو ڏسجي ٿو.  
غزل جا شاه بند به پڙهون ٿا:

وچوڙي مهل ماڻ هوندي مرڪ آ،  
وضاحت نه آڏو وڪيري وڃين هان.  
رڳو چيڙه هاڻي چڱون ٿو چٻاڙي،  
هڻي ميٽ، هڪڙي ته ڀيري وڃين هان.

هيٺئين شعر ۾ چيڙه، چڱون، ميٽ جهڙا لفظ هر آهنگيءَ ۾  
استعمال ڪيل آهن. شهرن ۾ ميٽ جي خبر نئين ٿي، ڪي شايد ئي هجي.  
ان ڪري ته هو شيمپو استعمال ڪن ٿا. اسان ٻاراڻي وهيءَ ۾ ميٽ  
استعمال ڪيو هو.

وچوڙي مهل ماڻ هوندي مرڪ آ،

هيءَ سٺ ته ضرب المثل ٿي پاسي. وچوڙي مهل ماڻ ميٽ ۾ گهاٽ برداشت  
ڪرڻ اعليٰ ظرف جو مظاهرو آهي. فني طور، ”مرڪ“ ۾ ڪ تي پيش آهي  
جنهن سبب وزن فعولن بدرن فعو بيهي ٿو، جيڪو فعولن هئڻ گهربو هو.  
بهرطور گوهر شيخ پنهنجي غزل ۾ ثقافتي ٻولي استعمال ڪئي آهي. اهو  
تجربو اتساهڪ چئبو. جيئن اماوس ۾ اوچتو چنڊ اڀري پئي، شعر ۾ به  
مانوس تشبيهه، ڪنارن جي ندرت سان شعريت اڀري پئي ٿي. شعريت ئي  
جماليات آهي.

شڪيل احمد جو نثري نظر آهي. سائنس منهنجي پهرين ملاقات  
محراب پور (ضلع نواب شاهه) ۾ ٿي هئي. ٻيهر سنڌ يونيورسٽي ڄامشوري  
۾ ملياسين. ٽيچرس هاسٽل ۾ دوست نويد سنديلي جو مهمان هيم. اءُ نثري



نظر ۽ آزاد نظر جو ڦاٽل آهيان، بس! ايترو چوندس، جيڪو ڪاوش دنيا  
۾ ڇپيل هڪ مضمون ۾ چئي چڪو آهيان ته:  
”جيڪو شاعر پابند شعر چئي ٿو، سو نثري نظر ۽ آزاد نظر به  
لکي ته قبوليو ويندو.“

نظر وجد ۾ آئيندڙ (Ecstatic) شعري صنف آهي. ڪيفيت آور  
خيال، ماورائي دنيا جو سٺو ڪرائي ٿو. صاحب ادراڪ (شاعر) نظر ذريعي  
هڪ نئين دنيا دريافت ڪري ٿو. هن صنف جو شمار بصيرت واري  
فن (Visionary Art) ۾ ٿئي ٿو، جيڪو رومانوي شاعريءَ جو خاصو آهي.

نظر جون ڪجهه سٽون هن طرح آهن:  
تاريخ مدي خارج دوائن  
۽ ڪريل گهڙيالن جا ڏير آهي  
اسان جو اڄ  
ڪالهه گذري چڪو آهي  
ماضي ئي اسان جو مستقبل بڻجي چڪو آ  
اسان موت وٽ مسواڙي آهيون  
اسان وٽ ڪوٽو وقت آهي  
جيڪو ڪٿي ڪپي ٿي نه ٿو  
ان ڪري اسان خريد ڪرڻ کان معذور آهيون  
وڻ اداس روح آهن  
جن ۾ ويرانيءَ جا جن  
واسو ڪري ويٺا آهن  
انسانن جون ڏليون  
اٿن جي پاڇولن جيان رڙنديون ٿيون وڃن  
اکين جي ڦاٽل پورين مان  
ڳوڙهن جو ان وهندو ٿو رهي  
پئي پئي خواب ڳسائي ويا آهن  
مهاڻا پيڙيون ڪپائي  
اُٺ خريد ڪري رهيا آهن  
وقت چريائپ جي رفتار سان اڳتي پوئتي ڊوڙي رهيو آهي  
دل جي ديوار تي  
وهي ڪرڙيون چنبري پيون آهن

هر ڪنهن وٽ قانوني جواز آهي  
 ته اهو ٻئي کي ماري سگهي ٿو  
 هر ڪنهن وٽ آسماني اجازت نامو آهي  
 ته اڳيون واجبل قتل آ.

شڪيل جو نظر بنا عنوان جي آهي. نظر ۾ گهڻا نظر سموڻا  
 اٿس. اهو معلق نظر آهي. گهڻي روشنيءَ ۾ اکيون نه ڏسي سگهن، اهو  
 اوندھ ۾ نه ڏسي سگهڻ جي برابر آهي. انگريز شاعر، وليئر بلڪ جا ٻه  
 نظر، هڪ ريڊ (The Lamb) ٻيو چيتو (The Tiger) مشهور آهن. ڇا ته پيٽ  
 ڪئي اٿس. ريڊ معصوميت جي علامت، چيتو چيري ڦاڙي کائڻ جي دهشت،  
 ۽ ٻنهي جو خلقتهار هڪڙو ئي. جانور ته ٻئي آهن، پر ٻنهي جي فطرت الڳ  
 الڳ.

نظر ۾ ابهام، ماورائيت، اڻ چٽائي پل هجي پر منجهس رس هجي  
 ته جيئن مزو اچي. ظاهري اک، يعني بصارت سان ته سڀڪو ڏسي ٿو. شاعر  
 صاحب بصيرت ٿئي ٿو. بصيرت (vision) ۾ اندر جي اک سان ڏسبو آهي.  
 شڪيل احمد ۾ اها صلاحيت آهي. بصارت به اٿس، بصير به اٿس. مثال  
 طور:

”تاريخ مدي خارج دوائن  
 ۽ ڪريل گهڙيالن جو ڏير آهي“

مٿيون ٻه سٽون به نثري نظر چئجي، ته وڏا نه ٿيندو.  
 ٽلهي ليکي ڳڻيم ته نظر ۾ 62 سٽون آهن. پهرين سٽ هيئن  
 آهي، ”ڪريل گهڙيالن جا ڏير آهي.“ ”جا“ جي صورت ۾، ”ڪريل گهڙيالن جا  
 ڏير آهن“ لکيو. يعني، ”آهي“ بدران ”آهن“. ”جو“ جي صورت ۾ ”ڪريل  
 گهڙيالن جو ڏير آهي“ لکيو.

نظر جي گهرج آهي ته فڪر شروع کان پڇاڙي، تائين آبشار جي  
 هڪ ئي وهڪري وانگر ربط ۾ هجي. ربط سان وحدت اثر نڪري پئي ٿو.  
 نئين شاعري، ”نئون تجربو آهي“. اهو تجربو جيسين هڻي هنڌ  
 ڪري، انتظار رهندو ته ڪڏهن ٿو شڪيل پنهنجي حد ادراڪ تائين ڦاري،  
 کي پهچڻ ۾ سهڪاري ٿئي.

نظر جي سحر ۾ آهيان. ڪنن ۾ ڪڙڪا به ٻجهن ٿا، سهڻيءَ کي  
 سک به آهي. سک ۾ ته نامڪن ممڪن ٿيو پئي. تارو ناهيان، تڏهن به  
 سنڌوءَ ۾ گهڙيو آهيان. لڏندڙ لمندڙ لهرون ته پينگهي جي لوڏ ياد ڏياري

اثر. لوڏ جو هيٺ مٿي ٿيڻ سان حرڪت واري بدلجندڙ سگهه مان لئي اڀري ٿي. چڪيل، تائيل رڳون ڏريون ٿي آهنگ ۾ اچن ٿيون ته اکين جا در پيڪڙجي وڃن ٿا. ٻاهرين دنيا جي وٽ وٽان کان ڏيان هٽي وڃي ٿو. هي ادبي نظريو ته ادب اهڙي پناهه گاهه جو ڪارج پورو ڪري جت چڪ تان گهٽجي، نه ڪي تهائين وڌي. خيال طرحين طرحين ته ايندا آهن، جيئن هوا ۾ برقي مقناطيسي لهرون موجود آهن، پر اهي جهڙي ٻڌڻ ۽ ڏسڻ لاءِ خاص مشيني اوزار گهرجن. ريڊيو تان آواز نشر ٿئي ٿو. ٽيليويزن تان نشر ٿيندڙ پروگرام ڏسي به سگهجي ٿو، ٻڌي به سگهجي ٿو.

شاعر ۽ عام ماڻهو، جي مشاهدي جي صلاحيت ۾ ايترو فرق آهي، جيترو ڪاٺ ۽ ٽامي جي پٽيءَ ۾ ٿئي ٿو. ٽامون بهترين بجليءَ جو پسرائيندڙ (conductor) جڏهن ته ڪاٺ بجلي گذرڻ کان روڪيندڙ (insulator) آهي. نفاست ۽ گرائپ مان چونڊ ڪبي ته شاعري نفاست سان پاڪرين پوندي.

مزمّل سائر جي شاعري جڏهن پڙهيم ته بجليءَ وارو ڪرنٽ محسوس ٿير. نظر ۾ اهو نظر ايندو ته شاعر ڪنهن سان مخاطب آهي. جيئن سندس هن نظر ۾ مخاطب پترو آهي:

”ٻري تند تنهنجي آڇاتي، اڳن،  
پٺاڻي، سڄي ڏيهه تنهنجي لڳن.“

## ٽن ميمن جو پختو شاعر - قربان گل

اسان جي پياري دوست امراقبال قربان گل جي شعري مجموعي جي مهاڳ ۾ هي لفظ ته ”تنوير عباسي صاحب چونڊو هو ته شاعري تي مير گهرندي آهي. مشاهدو، مطالعو ۽ مشق. هڪ شاعر وٽ مشاهدي جي لاءِ ”التي اڪ“ هئڻ لازمي آهي. کيس مطالعي لاءِ سليڪٽو هئڻ گهرجي (ڇاڪاڻ ته محدود حياتي ۽ محدود وقت ۾ محدود ڪتاب ئي پڙهي سگهجن ٿا... ها ”مشق“ جي سلسلي ۾ وٽس ايتري قدرت ضرور هئڻ گهرجي ته اڏامندڙ لفظن کي جهٽي، ڪنهن شعر جي صورت ۾ مخصوص فارميت ۾ کڻائي بيهاري سگهي. انهن سڀني ڳالهين کي گڏائي سڏائي مان جڏهن قربان قربان گل جي شاعريءَ جي مسودي کي پڙهان ٿو ته محسوس ٿو ڪريان ته کيس انهن تنهي ”ميمن“ کي پرپوريت ۽ چٽائي سان ماڻڻ لاءِ اڃان گهڻو جهڊ ۽ گهڻا جتن ڪرڻا آهن. (ص: 10)

اهي لفظ پڙهڻ بعد مون سوچ ڪئي ته ڪتاب مشاهدي، مطالعي ۽ مشق مان ڪنهن ۾ به ڪا خصوصيت نه ٿو رکي ته پڙهجي؟ خلوص مان مليل تحفو مون وقتي طور رکي ڇڏيو پر خلوص مونکي پڙهڻ تي مجبور يو. ڪتاب پڙهڻ بعد مون کي پنهنجي پياري دوست امراقبال جي راءِ سان سهمت هجڻ تان هٿ ڪڍڻو پيو. ڪتاب ۾ تنهي ميمن مشاهدي، مطالعي ۽ مشق کي چڱي خاصي حيثيت مليل آهي. سڀني ميمن جا پرپور مثال موجود آهن. هن ٻن ۾ ڪا مشاهدو هي:

هتي ته هي ڪاروبار آهي

رڳو ٿئي ٿي مٿا ڏکن جي. (ص: 43)

دنيا ۾ هڪ ٻئي کي ڏک ڏنا ٿا وڃن، اهو هن دور جو خاص الميو آهي. هر طرف عالمي ليول تي انسانن تي ٻر وسايا وڃن ٿا. گوليون هنيون ٿيون وڃن. ملڪن تي قبضا ڪيا پيا وڃن. معاشي پابنديون هڻي ماڻهن کي بڪ ماريو ٿو وڃي. مقامي ليول تي ڇا نه ٿو ٿئي انسان گيترا گيترا ڪيا وڃن پيا. ڊرل مشين سان جسر ۾ سوراخ ڪيا وڃن ٿا. معصوم ٻارڙين/ ٻارڙن تي به جنسي تشدد ڪيو پيو وڃي. قربان گل دنيا جو مطالعو ڪري ٻڌايو آهي ته سڄي دنيا ۾ ڏکن جو ڪاروبار پيو هلي ماڻهو هڪ ٻئي کي ڏک ڏئي رهيا آهن.



هنن ستن ۾ ڇا ته مطالعو آهي :

قلم سان ايندا رهن ٿا انقلاب،

تنهنجي اک آهي رڳو هٿيار ۾. (ص: 48)

قلم جي عظمت قرآن پاڪ ۾ چوڏهن سئو سال اڳ هن طرح ٻڌائي وئي آهي:

ن \_ والقلم و ما يسطرون. (سورت القلم: 1 + 2)

ترجمو: قلم جو قسر ۽ ان جو قسر جيڪي لکن ٿا .

الله پاڪ قلم ۽ ان جي لکڻ جو قسر کڻي ٻڌايو ته قلم سان وڏا ڪم ٿين ٿا. قلم ڪلڪ، پين ٿي نه آهي پر هر لکندڙ کڻي قلم آهي. پرنٽ ميڊيا تي لوھ جا اکر لکن پيا. هاڻي انٽر نيٽ جي دور ۾ بٽڻ ۽ آواز لکي ٿو. ان صورت ۾ بٽڻ ۽ آواز قلم بڻجي ويا آهن. ان قلم ڇمڙي تي لکيو، ڪاغذ تي لکيو ۽ هاڻي اسڪرين تي لکي ٿو پيو. انهن لکتن دنيا ۾ ماڻهن لاءِ مختلف علم لکي پهچايا. ان سان سماجي، سائنسي ۽ مذهبي انقلاب آيا. قربان گل انهن انقلابن جي ذريعن جو مطالعو ڪيو ۽ پوءِ ٻڌايو ته فقط هٿيارن سان انقلاب نه ايندو آهي. قلم ۽ پڙهڻ سان به وڏا انقلاب ايندا رهن ٿا ۽ آيا آهن. قربان گل جي پڪي مطالعي جي شاهدي سندس شاعري ڏئي پئي.

مشق جو هي حال آهي جو لکي لکي هو غزل ننڍي بحر ۾ لکي ٿو. ننڍو بحر مشق کان سواءِ هٿ نه ايندو آهي. مان اهو ڪو نه چوندس ته سندس شاعريءَ ۾ فني خاميون ڪونه آهن پر اهو سندس مشق جو ڪمال آهي جو سندس غزل اڪثر طرح ننڍي بحر ۾ لکيل آهن. ننڍي سٽ ۾ وڏي ڳالهه ماپائڻ فني خوبيءَ جو وڏو مثال آهي. سندس قافيا به اڪثر نوان ۽ سٺا آهن. سندس ڪتاب ۾ ڪيتريون علامتون، تشبيهون ۽ استعارا ڪم آيل آهن. جن تي جدا جدا مقالا لکي سگهجن ٿا سي پڪي مشاهدي ۽ مطالعي جي ته شاهدي ڏين ٿا پر مشق يا فن جي ڀلي هجڻ جي به شاهدي ڏين ٿا ۽ تنهنجي ميمن تي تمام گهڻو ۽ سٺو مواد موجود آهي آخر ۾ سندس مطالعي جي شاهدي تي مقالي جو اختتام ڪندس ته:

سند سڄي هيرن کان،

مورڪ! توکي ناهي ڄاڻ،

ارغون ۽ ترخان به هئا،

هي به آهن اڄ سڀاڻ. (ص: 50).

## سنڌي ڪنڊ جو يگانو شاعر سرڪش سنڌي

جديد سنڌي شاعريءَ جي اهم حوالي سرڪش سنڌيءَ جو اصل نانءُ عبدالمجيد پٽ مولوي عبدالله چانڊيو هو. سندس جنم ڳوٺ ڀلي پوٽا سیتا وليج ضلعي دادو ۾ پهرين آڪٽوبر 1840ع تي ٿيو. سرڪش سنڌي 27 ڊسمبر 1961ع تي تعليم کاتي ۾ استاد طور مقرر ٿيو. هن شاعريءَ جي شروعات 1954ع کان ڪئي. هن جو پهريون ادبي نالو ”مجبور واراھي“ ۽ وقت جي وهڪري ۾ هي نالو به گهڻي وقت تائين قائم نه رکي سگهيو. بعد ۾ ادبي تخلص ”پاور سعد واهي“ ۽ ٿوري ئي ڏينهن کان پوءِ ”سرڪش سنڌي“ جي ادبي نالي سان سڃاتو ويو. سرڪش سنڌي مذهبي شاعري به ڪئي آهي، ۽ هن جي ادبي حلقن ۾ انقلابي شاعر طور پختي سڃاڻپ جڙي. جڏهن هن سنڌ جي اشوز تي پرپور انداز سان شاعري ڪئي. هن جي وارين پينٽ ٻاري ڇڏيو.

اڀ جي ڪاري منهن تي ريڪا ڳاڙهي، نيري پيلي ايندي  
پوءِ ته ڪا تبديلي ايندي.

يا

منهنجي ڏيهه جي مٿڙن مارن سان رکيو جنهن وير  
پوندس ڪاريهر تي پير.

ادبي حوالي سان آئون ان نتيجي تي پهتو آهيان ته سرڪش سنڌي بنيادي طور تي علم عروض جو شاعر رهيو آهي، غزل گوئيءَ جو انداز، وٽس منفرد ۽ اترادي لهجي وارو شاعر آهي.

سرڪش سنڌي جا غزل به ترقي پسند ۽ قوم پرست راڳين شوق سان ڳايا. ڪنهن هڪ اڌ غزل جو مطلعو نه هجي ته نه هجي. باقي اڪثر غزل ٻا مطالعا ۽ بامقطعا آهن. غزل جي فن کان هو چڱي طرح واقف هو، عالم گهراڻي جو فرد هو، تنهن ڪري علم عروض تي کيس عبور هو. سرڪش سنڌي غزل کي غزل جي ٻوليءَ ۾ رچي، راس ڪيو، وٽس

اڪثر غزل مسلسل غزل جي فني پيرائي ۾ ٿا. اچن، جيئن استاد بخاريءَ کي گهڻو ڳايو ويو آهي، ايئن سرڪش سنڌيءَ کي ڪونه ڳايو ويو آهي، جيئن ته غزل گائڪي جي صنف آهي، ان کي ايتري انداز ۾ ناهي ڳايو ويو. سرڪش سنڌي جو قومي طبقاتي نظريو مضبوط ۽ دل پذير هو، پهريان وٽس جمهوري قدر ڪثرت ۾ ها، پر پوءِ صرف قومي ۽ طبقاتي ڌارا ۾ هليو. سرڪش سنڌي جو غزل:

ساري جڳ کان پاسيرا ٿي پيار ڪيوسي،  
 پوءِ به جڻ دنيا جي دل تي بار ڪيو سي.  
 چنڊ! اڄوڪي رات نه پنهنجون پور اڪيون،  
 ورهين جي ويرائن کي گلزار ڪيو سي.  
 تاساريل هن روح جي تاس لهڻ چاهير،  
 وڌندي ويئي جيئن پئي ديدار ڪيو سي.  
 گهايل ڏينهن جا گهاو ڳڻي ڪو ڏيڪاري،  
 هيءَ حياتي ڏنڊ ڏبي، اقرار ڪيوسي.  
 پرھ جي پنڀڻين سامهون آيو سنڌو جيئن،  
 پنهنجي چاه جو ٿانءُ کڻي تمار ڪيوسي.  
 ڪيئن بچي خوشبوءِ هوا جي چغرين کان،  
 اوتي ڪير ڪٿوري ۾ ويچار ڪيوسي.  
 ”سرڪش“ جڻ ته گلاب اکين ۾ پوکيا ٿي،  
 سڀني پاڻهي سمجهيو ڪٽ اظهار ڪيوسي.

سرڪش سنڌي ۽ سندس محبوبا جا ويچار جهڙا به ها، پر عشق جو احوال ۽ مُشڪ جي ڪٿوري ڪٿي ٿا لکي سگهن. سماجي قانون ڏاڍو پيچيدا ۽ پروس هوندا آهن. ماڻهو پيار جي پرچار ۾ چريا ٿي پوندا آهن، پيار ۽ محبت جي دنيا جهڙوڪر ماڻهن جي مٿي تي پهڙ ڪڙڪائي وجهندي آهي، توڻي جو اهو سڄو مامرو ماڻهن جو نه هوندي به ماڻهن لاءِ مسئلو بڻجي ويندو آهي. ڪنهن جي پيار تي هروڀرو به ماڻهن جو مَن ڪرڪي پوندو آهي ۽ پيار وارن جا پَر ساڙي، انهن جي اڏام ۾ عشق جا

دُشمن ٿي بيهندا آهن. پيار جون ڳالهيون ڪرڻ، غزل جي پهرين گهرج آهي، سرڪش جو پيار ۽ پيار جو اظهار هڪ عجيب مامرو بڻجي ويو. چنڊ! اڄوڪي رات نه پنهنجون پور اڪيون، ورهين جي ويرائن کي گلزار ڪيوسي.

چنڊ چڪورن ۽ چاهت وارن جو همراز ۽ هر خيال آهي. جيڪو پنهنجي چانڊوڪي، جي چانڊاڻ سان ساڻن گفتگو ڪندو رهندو آهي. ڪيئي ورهين جا ويچار بحث هيٺ ايندا رهندا آهن. چنڊ ڪنهن جو راز فاش ناهي ڪندو. پيار بنان هي جڳت جهان وره وارن لاءِ ويرانو آهي، جي ان سرزمين تي ڪي به ڌڙڪندڙ دليون چاهينديون ته اهو ويرانو واقعي گلزار بڻجي ويندو.

تاساريل هن روح جي تاس لهڻ چاهير،  
وڌندي ويئي جيئن پئي ديدار ڪيوسي.

سرڪش سنڌي جي غزل جي ٻولي به ڪاڇي جي ڳيرن واري آهي. جيڪي پياس ۽ تاس جي دامن ۾ جيون گهاري رهيا آهن. پيار کي ڪڏهن به پورو ڪرڻ جو دم هن پيار وارن جي وس ۾ ناهي رهيو. پيار جي ازلي اڄ ڪٿي ٿي اجهي، پيار هڪ مسلسل خواهش جو ازلي اسر آهي، غزل جي محبت پري ايجاد به اها اڄ نه ٿي اجهائي سگهي.

گهايل ڏينهن جا گهاو ڳڻي ڪو ڏيکاري  
هيءَ حياتي ڏنڊ ڏبي، اقرار ڪيوسي.

پيار تي پهرن ۽ بندش جا گهرا گهاو سڄو اندر پُرڻ جيان چاڻي ۽ چلڻي ڪري ڇڏيندا آهن. اهي احساسن جا اڻ ڳڻيا ڌڪ ڪير ٿو وڃي ۽ جاچي سگهي.

سرڪش سنڌي سندن ڳڻپ جي ان حسابي سُڃاڻ پائي تي نه صرف پنهنجي، پر محبوبا جي زندگي به تاوان ۾ ڏيڻ لاءِ تيار آهي ۽ وعدو ٿو ڪري. سرڪش سنڌي جو هي مسلسل غزل يا غزل در غزل پنهنجو تفسير پاڻ آهي.

پرھ ڄم، پنڀڻين سامهون آيو سڻو جيئن،  
پنهنجي چاه جو ٿانءُ ڪڍي ٽٽار ڪيو سي.

هن بند ۾ ”سرڪش“ ۽ محبوبا جو من ڀرجي ٿو وڃي، اهو تشبيه



جو نيم ۽ نمونو صرف سرڪش سنڌي جي ٺڪي پوي ٿو. اندر به سنڌوءَ  
جيان پريل هجي لڙڪ به نه لڙي، غزل جي گفتگو ۾ اهڙي گوناگونيت ۽  
انفراديت ڏاڍي معنوي اڇوت پائي، واري آهي. جنهن کي شايد ڪنهنجي  
جهڻ جي سگهه سوين پيرا سوچيندي سُن ٿي ويئي هجي.

ڪيئن بچي خوشبوءِ هوا جي چُغلين کان،  
اوتي کير ڪٽوري ۾ ويچار ڪيو سي.

پيار جي پرچار کي سرڪش سنڌي خوشبو جي پيٽا ڏيندي، چُغل  
خور ماحول جي چُٽ پُڇُٽ کي هوا سان مشبهه بنايو آهي، واقعي کير کان  
اجرو پيار اندر ۾ اوتيندي، ويچار ڌارا ۾ اچي ٿا وڃن. بقول سرڪش  
سنڌي جي.

سرڪش سنڌي جو هي غزل عشق ۽ حسن جي گڏيل سفر جو منڙو  
نانءُ آهي. جنهن غزل جي ٻولي ۽ فن کي جرڪايو ۽ مرڪايو آهي.  
غزل جو مقطعو.

”سرڪش“ ڇڻ ته گلاب اکين ۾ ٻوڪيا ٿي،  
سڀني پاڻهي سمجهيو، ڪٿ اظهار ڪيو سي.

عشق جا اوجاڳا ۽ ڳاڙهيون اکيون، پيار جو پهريون قلم ٻوڪي  
اڪيون نارڻ ۽ اهڙا ڪيئي اڻ چيا ويچار هن مقطعي ۾ سمايل آهن.  
سرڪش سنڌي سنڌي شاعريءَ جو اهم نانءُ آهي، هن جي ڪم تي  
فخر پوري سنڌ ڪري ٿي. حياتيءَ جي آخري ورهن ۾ سرڪش سنڌي کي  
ڪينسر جهڙي موذي مرض ڪمزور ڪري ڇڏيو. 05 مارچ 2012ع تي هي  
ڪوي سنڌ امڙ جي گود ۾ ازلي آرامي ٿيو.  
سرڪش سنڌي جا هيٺيان ڪتاب سندس جيئري ڇپجي پترا ٿيا هئا.

- درد دل 1984ع (شاعري)
- امن آب حيات 1987ع (شاعري)
- پيار ۽ آزادي 1990ع (شاعري)
- سنڌو ڳائي ٿي. 2000ع (شاعري)
- سمنڊ، ڇوليون ۽ ٽهڪ 2003ع (شاعري)
- جوڻيون جيءَ، جهان جون. آتم ڪٿا 2007ع (نثر)
- جوڻيون جيءَ، جهان جون. آتم ڪٿا 2009ع (نثر)

- زندگيءَ جي گونج 2010ع (شاعري)
- سرڪش سنڌي جي شاعريءَ جي مطالعي کان پوءِ هيءَ راءِ صاف ۽ چٽي ٿي آهي ته:
- شاعري جي فني علم ۽ ڇند وديا ۽ علم عروض جي شاعراڻين صنفن ۾ لکندڙ شاعر آهي.
- وائي ۽ غزل جو پختو شاعر آهي.
- سنڌ جي ٻرندڙ مسئلن تي لکندو رهيو آهي. جنهن جي ڪري سرڪش سنڌي کي قومي شاعر جو لقب مليو آهي.
- رومانوي شاعري ۾ به هن پاڻ موڪيو آهي.
- شاعراڻي ٻولي ۽ شاعراڻي فن تي عبور رکندو هو.

\*\*\*

## قمر شهباز جي شاعريءَ ۾ وجوديت جو فڪر

فرد جڏهن پنهنجي هجڻ تي سوچيو ته هن کي پنهنجي وجود جو پتو پيو. پنهنجي موجودگيءَ جو احساس کيس ستائڻ لڳو ۽ وجود جي گهرجن کان کيس آگاه ڪندو رهيو. ”وجوديت هڪ اهڙو فيلسوفياڻو رنگ آهي جنهن ۾ پاڻ سڃاڻڻ ۽ فرد جي داخلي برتري ۽ اتم پئي جي ڳالهه علامتي تناظر ۾ پيش ڪئي وڃي ٿي. وجوديت نه صرف هڪ هاڪاري سرگرمي ۽ فلسفو آهي پر اهو هڪ ”عملي دائرو“ (Practical Ring) يا سرڪل پڻ آهي جنهن ۾ اچي انسان ڪيترين ئي اهم جبلتن سان مهاڏو اٽڪائي ٿو. ۽ انهن جبلتن جي آڌار پاڻ سڃاڻڻ ۽ پاڻ مڃاڻڻ جي ڪيترن ئي مرحلن مان گذري نيٺ پنهنجي وجود ۽ وجودي سگهه کي مڃائي ٿو. جڏهن انسان کي پنهنجي هجڻ جو احساس ٿيو ته هن پنهنجي وجود کي سڃاڻڻ جي ڪوشش ڪئي. هن پاڻ کان سوال ڪيو ته کيس ڇا ڪرڻ گهرجي؟ سندس ان سوال ۾ اهو امر بحرحال موجود هو ته هو ڪجهه ڪري سگهي ٿو. پاڻ سڃاڻڻ لاءِ مختلف مرحلن مان گذري فرد پنهنجي سمجهه ۽ ڏاهپ جي آڌار پنهنجو وجود يا ”موجود هجڻ“ طئي ڪري ورتو.“

وجوديت واري فلسفي هيٺ فرد پنهنجي اهميت تلاش ڪري تقدير جي فلسفي کي رد ڪري ٿو، هن جو خيال هوندو آهي ته هو پنهنجي سگهه جي آڌار ڪوبه عمل ڪري سگهي ٿو، لحاظ تقدير پڻ هو پاڻ لکي يا مٽائي سگهي ٿو. اهو وجودين جو خيال آهي. ڇاڪاڻ ته ”وجودين جي سامهون انساني وجود ئي سڀ ڪجهه آهي. سندن چوڻ آهي ته انساني ڪائنات کانسواءِ ڪابه ڪائنات ناهي، ۽ اهائي اصل ۾ انسان دوستي آهي. جنهن تحت هو انسان کي باور ڪرائين ٿا ته انسان کانسواءِ ڪوبه سندس لاءِ قانون نٿو جوڙي سگهي.“ اسان چئي سگهون ٿا ته وجوديت انسان جي وجود سان گڏ ئي وجود ۾ آئي آهي. ٻين گهڻن لاڙن، خيالن، تصورن ۽ عنصرن وانگر وجوديت جو تصور به ان جي فيلسوفياڻي حيثيت ۾ اچڻ کان گهڻو اڳ موجود هو. ڪرڪيگارد اهو پهريون فيلسوف هو جنهن کي

وجوديت جو باني تصور ڪيو وڃي ٿو؛ هو پنهنجي فلسفي لاءِ چوي ٿو ته کيس ڊپ آهي ته ڪائنس پوءِ سندس فلسفي کي غلط رنگ ۾ ڏٺو ويندو، ڇاڪاڻ ته ماڻهو سندس فلسفي کي سٺن ۾ سمجهڻ جي ڪوشش ڪندا جڏهن ته سندس فلسفي کي سمجهڻ ڪا عقل کان وڌيڪ تخيل ۽ وجدان جي ضرورت آهي. قاضي قيصر الاسلام پنهنجي مشهور ڪتاب فلسفي جا بنيادي مسئلا ۾ ڪريڪيگاردجي ڪتاب ”Either/Or“ جي حوالي سان زندگي کي ٽن مرحلن ۾ ورهايو آهي. ”هڪ فرد جمالياتي ڪيفيتن مان گذري اخلاقياتي عالم ۾ پهچي ٿو ۽ پوءِ روح جي ابديت جي ڳولها ۾ لڳي وڃي ٿو. فرد پنهنجي وجودي حيثيت سبب ڪائنات ۾ موجود ٻين وجودن سان ٽڪراءُ ۾ ته اچي ٿو. پر پنهنجي عقل ۽ علم جي آڌار ڪامياب ٿي وڃي ٿو. ڇاڪاڻ ته ڪائنات ۾ انسان اهو واحد وجود آهي جيڪو پنهنجي گهرجن کي ڄاڻي ٿو، ٻين وجودن جي گهرجن کي ڄاڻي ٿو ۽ پنهنجي توڙي ٻين جي پلي لاءِ ڪجهه ڪري ٿو.

وجوديت بحیثیت سماجي تحریک جي موجود حالتن جي بر خلاف هئي.

"Existentialism" is an intrinsically reactive movement of thought.

يعني وجوديت بنيادي طور تي هڪ ردعمل طور اڀري آيل تحريڪ هئي. ۽ اها تحريڪ انسان ذات جي پلي لاءِ شروع ڪئي وئي جو سارتر جهڙي ماڻهو چيو هو ته وجوديت ئي اصل ۾ انسان دوستي آهي. ڊاڪٽر غفور ميمڻ پنهنجي ڪتاب ”سنڌي ادب جو فڪري پس منظر“ ۾ لکي ٿو:

”وجوديت انسان کي ماورائي هستي (Transcendent) سان ملائي ٿي... انسان انهيءَ وقت صحيح معنيٰ ۾ انسان ٿيندو جڏهن انهيءَ جو رشتو ماورائي هستيءَ سان ڳنڍجي ويندو ۽ وجودي نقطه نگاهه سان انسانيت جي معراج تي پهچي ويندو.“

ڪنهن به لاڙي يا ٿيوري جو اصل ڪم انسان ذات جي پلي سان سلاهاڙيل هئڻ گهرجي، اهڙيءَ ريت انسان ذات جي آزادي ۽ آجپي لاءِ وجوديت واري نظريي پرپور ڪم ڪيو ۽ عملي ميدان ۾ انسان جي پلي لاءِ جاکوڙيو ويو، خاص طور جنگين دوران موت جي شرح وڌڻ ڪري فرد ويڳاڻو ٿيو ته وجوديت واري نظريي ئي کيس پنهنجو ڪندي آڻڻ ڏني. ۽ سارتر وجوديت واري تحريڪ کي انسان دوستيءَ جي جو نالو ڏئي ان تحريڪ ۾ نئون روح ڦوڪيو.

فرد جي جاکوڙ، انسان ذات جي پلي لاءِ پڇ ڊوڙ، پریشاني، ڳڻتي ڳارائو،



ويڳاڻپ سڀ وجودي فڪر ۾ اچي وڃن ٿا. هتي اسان قمر شهباز جي شاعريءَ مان وجودي فڪر سان سلهاڙيل شاعري جو جائزو پيش ڪيون ٿا.

وڪري ويندا گيت خوشيءَ جا، وچڙي ويندا يار،  
پل پل تنهنجو پيار ڏنگيندو، ساعت ساعت سار.

ترڪي ايندو، تڙ تي آنسو، روئين زارو زار،  
منهنجون يادون بنجي ايندو، دل تي غم جو بار.

ياداشت وجوديت جو هڪ وڏو موضوع آهي، هونئن ته فرد مزاحمت، محبت ۽ بڪ وسيلي پنهنجي وجود سان ويجهڙائي قائم ڪندو آهي، پر ڪنهن جي يادگيري پڻ وجود سان ويجهي اچڻ جو وڏو سبب هوندو آهي. ڇاڪاڻ ته ياد سان ماڻهو پنهنجي ذهني لاڙي ۽ خواهش جي ويجهو ٿيندو آهي، ۽ اهڙي خواهش ڪنهن جي پيار جو سگهارو دليل هوندو آهي. قمر شهباز جي شاعريءَ ۾ ياد جو موضوع تمام گهڻو آهي هو پنهنجي بيتن توڙي وارين ياد کي پرپور موضوع بڻائي ٿو.

تو کي ياد ڪري، او مٽڙا، اڪڙيون پر جي آيون،

منهنجون اڪڙيون پر جي آيون.

رات پُني آ، پيچ پني آ، تو لئه آس لڳايون.

اڪڙيون پر جي آيون.

سي ڪين، سڀاڏنديون، جي تنهنجي گهورن گهايون.

اڪڙيون پر جي آيون.

يادون منهنجون يادون ناهن، تو جيئن ٿيون پرايون.

اڪڙيون پر جي آيون.

صدين جو آسا، مٺا، سو پل ۾ ڪين، پلايون.

اڪڙيون پر جي آيون.

پل پل پٽڪن منهنجي من ۾ يادن جون پرچايون.

اڪڙيون پر جي آيون.

ياد ڪنهن به فرد جي نفسياتي ڪيفيت تي اثر ڇڏي ٿي ۽ نتيجي طور

ڪنهن خوشگوار لمحي جو ذهن تي تري اچڻ سبب فرد پنهنجي وجود

تي هڪ وڻندڙ لهر محسوس ڪري ٿو. اها اهڙي لهر آهي جيڪا فرد کي

پنهنجي وجود سان جوڙي رکي ٿي.

ڄاڻان ٿو تون منهنجو ناهين،  
ڪنهن جي ٻانهن ۾ ئي ڪلندين:  
ڇڻ، ٻيهر پوءِ ڪاٿي ملندين؟

شام جڏهن شمشان ٿي ويندي،  
جيءُ ۾ جوالا بنجي جلندين:  
ڇڻ، ٻيهر پوءِ ڪاٿي ملندين؟

اکڙين جي اڳڻڌ تي مُرڪي،  
خوابن جي خوشبو ٿي گهلندين  
ڇڻ، ٻيهر پوءِ ڪاٿي ملندين؟

يادن جي وادين ۾ پيهي،  
موه منجهاران مرڪي ٿلندين  
ڇڻ، ٻيهر پوءِ ڪاٿي ملندين؟

جنهن سان پيار هجي ان وجود جو ڪنهن ٻي سان سلهاڙجي وڃڻ  
۽ من ۾ ان سان ٻيهر گڏجڻ جي اميد جو اڀرڻ ۽ شام جي وقت جو شمشان  
۾ تبديل ٿيڻ، يادن جي وادين ۾ ان وجود جو ٻرڻ ۽ ذهن ۾ خوابن مان  
خوشبوءِ جو اچڻ، موه مان محبوب جو مرڪي ٿلڻ وغيره جهڙا استعارا  
هڪ نئين وجودي آهنگ ڏانهن اشارو ڪن ٿا. پر ان سموري ڪٿا ۾ فرد  
پاڻ ذميوار آهي. ڇاڪاڻ ته وجوديت ”فلسفي جي دنيا ۾ اُڀريل هڪ نظريو،  
جنهن مطابق هن بي معنيٰ دنيا ۾ انسان آزاد ۽ پنهنجن عملن لاءِ پاڻ  
جوابدار آهن. هڪ تحريڪ جي حيثيت ۾ ان جو زور انفرادي وجود جي  
داخلي مسئلن، انفرادي آزادي ۽ انساني نفسياتي وارتائن جي سندس  
سماجي روين تي پوندڙ اثرن جو تجزيو ڪرڻ هو. ان تحريڪ اڻويهين ۽  
ويهين صدي عيسويءَ جي ڪيترن ناميارن ليکڪن تي اثر ڇڏيو.  
ڪريڪيگارد، هيڊگر، بوبر مارسل، ڪافڪا، ڪاميو ۽ سارتر وغيره هن  
تحريڪ جا روح روان رهيا آهن. وجوديت جي فڪر ٻي عالمي لڙائيءَ  
کانپوءِ تباهه ۽ پڙپانگ ٿيل يورپ ۾ تمام گهڻي شهرت ماڻي ۽ جنگ جي  
نتيجي ۾ ماڻهن منجهه پيدا ٿيل مايوسي ۽ بيزاريءَ جي جذبن جي ادب ۽  
ٻين شعبن ۾ ڀرپور عڪاسي ڪئي.“

هن نظر ۾ قمر شهباز اداسيءَ جي تصوير کي هن طرح بيان ڪري ٿو،

جڏهن تنهنجي رنگين محفل ۾ سائين،  
اداسيءَ جي تصوير بنجي مان آيس،  
ڌڪاري ڇڏين ها - ڌڪاري ڇڏين ها!

خاموش راتين ۾ هڪ سوال بنجي،  
خوابن ۾ تنهنجي، ٽپي جي مان آيس،  
تون ماري ڇڏين ها - تون ماري ڇڏين ها!

يادن کان منهنجي جي چرڪي ائين ٿو،  
تصور جي ته ۾، لڪي جي مان آيس،  
وساري ڇڏين ها - وساري ڇڏين ها!

جوان تنهنجي محفل سدائين آ سائين،  
فقط سُڪڙيءَ لاءِ، سڪي جي مان آيس،  
پياري ڇڏين ها - پياري ڇڏين ها!

شاعر جو پنهنجي محبوب کان اهڙي التجا ڪرڻ ته ”آئون جڏهن  
تنهنجي رنگين محفل ۾ اداسيءَ جي تصوير بنجي آيو هئس ته ان وقت  
مونکي محفل مان اٿاري ڇڏين ها، يا جڏهن آئون خاموش راتين ۾ سوال  
بنجي تنهنجي خوابن ۾ آيو هئس ته تون مونکي ماري ڇڏين ها، آئون  
جڏهن تنهنجي يادن جي تهن ۾ لڪي آيو هئس ته تون وساري ڇڏين ها،  
تنهنجي محفل ته سدائين ائين ئي آباد رهڻي آهي، جيڪڏهن آئون اڃارو تو  
وٽ آيو هئس ته ٿورو مونکي به پيارين ها ته سٺو ٿئي ها،” شاعر جي اهڙي  
التجا يقينن هڪ وجود جي مڪمل عڪاسي ڪري ٿي.

وري ياد آئين

وري ياد آئين، وري نيٺ نايا!  
واٽن تي ويهي مون جوت جلائي،  
لکين لڙڪ ۾ پوئي مون مالها بنائي،  
مون تولا ساجن ڪيا سهج سايا:  
وري ياد آئين، وري نيٺ نايا!

اهو گيت ڳاتڻ جو ڳائي نه ڄاڻين،  
ڏکيو پيچ پاتڻ، نٻاهي نه ڄاڻين،  
نه ڄاڻي ته ڇو لڙڪ مون ٿي لڪايا:  
وري ياد آڻين، وري نيڻ نايا!

ٿڙي گل ٿيا مڪڙيون، مون توکي پڪاريو،  
ڪڙيا ڪئي ستارا، مون چرڪي نهاريو،  
اميدن جا ڏيڙا مون ٻاريا وسايا:  
وري ياد آڻين، وري نيڻ نايا!

مون کي ياد آهن مسرت جون پلڪون،  
ڪنهن جي اکين ۾ ڏنيون ڇنڊ جهلڪون،  
مگر اڄ خزان آ، اداسي، جا سايا:  
وري ياد آڻين، وري نيڻ نايا!

اسان جون بهارون ڪنهن ري، نماڻيون،  
اميدن جون مڪڙيون، بي موسم ڪڍائون،  
جي پنهنجا پرايا، پرايا - پرايا:  
وري ياد آڻين، وري نيڻ نايا!

گيت نما هن نظر ۾ قمر شهباز جن اداسين، اڪيلاين، اميدن  
جي مڪڙين جي ڪومائڻڻ، انتظار جي ڪيفيت، درد جي امنگ، سار جي  
خوشبوءَ جو ذڪر ڪيو آهي، اهو سمورو بيان وجودي واردات جو حصو  
لڳي ٿو.

مجموعي طور تي قمر شهباز جي شاعريءَ ۾ جتي جمالياتي، رومانيت ۽  
فطري سونهن جو ذڪر ملي ٿو اتي وجوديت ۽ وجودي وارداتن بابت پڻ  
سندس فڪري نقطہ نظر پترو ٿي ملي ٿو. اهائي سندس شاعريءَ جي اصل  
سڃاڻ ۽ سونهن آهي.



## پير بخش خان عرف پيرل فقير جوڻيجو

سنڌ ڌرتي جي جڏهن به تاريخ کي پڙهجي ٿو ته سنڌ اندر ڪيتريون ئي پنهنجو نمايان ڪردار رکندڙ انيڪ شخصيتون نظر اچن ٿيون. جن پنهنجي دور ۾ اهم ڪردار چڏيو آهي، اهڙين ئي شخصيتن ۾ جوڻيجو قبيلي جو معزز شخصيت پير بخش جوڻيجو عرف پيرل فقير به پنهنجو ڏس ڏئي ٿو.

ڪنڊو واهڻ ڳوٺ تعلقي سکر ۾ واقع آهي هن ڳوٺ ۾ جوڻيجا اڪثريت سان رهن ٿا، هن ڳوٺ جي زميندارن ۾ علي بخش ولد پير بخش جوڻيجو پنهنجو الڳ مقام رکي ٿو، علي بخش جوڻيجو پنهنجي وقت جو سٺو زميندار رهيو آهي، خطن ۽ تاريخ مان معلوم ٿئي ٿو ته سنڌ جي ڪيترين ئي وقت جي زميندارن ۽ معززن سان سٺا تعلقات قائم هئا. جن ۾ خان بهادر رسول بخش خان جوڻيجو مرزاپور، رئيس ڪريم بخش خان ناپر ڪوٽ ناپر ضلع شڪارپور، خانصاحب امير بخش خان مهر تماچائي، خان صاحب تاج محمد خان پٺاڻ باگڙجي وارو، ميان عبدالستار پيرزادو سکر وارو، آغا غلام صفدر خان پٺاڻ شاهه عبداللطيف ڀٽائي جو گادي نشين پير سيد شاهه ڏنو شاهه ڀٽائي ۽ سيد غلام حيدر شاهه گادي نشين درگاهه بلڙي شريف وارا اچي وڃن ٿا. جن سان تعلق جو احوال سندن لکيل خطن مان ملي ٿو. ان کانسواءِ وقت جي حڪمرانن ۽ ڪامورن سان به تمام سٺا تعلق هئا، جن جا لکيل دعوت نامو ۽ راءِ وٺڻ لاءِ سڏ به رڪارڊ تي موجود آهن.

علي بخش خان جوڻيجو سن 18 آگسٽ 1964ع ڌاري ڇنڇر جي ڏينهن هن دنيا مان لاڏاڻو ڪيو. سندس قبر باگڙجي شهر جي قبرستان پير ظاهر زڪريا ۾ موجود آهي. ان کان پوءِ خليفو ڌڻي بخش پيدائش سن 1928ع ڌاري آهي. سندس پويان پڳ پهري پاڻ پنهنجي والد کان پرورش ۽ تربيت ورتائين. پنهنجي وقت جو سٺو زميندار رهيو. جيڪو اڄ ڪنڊو واهڻ ۾ ڀٽائي جو اوتارو آهي سو سندس ئي محنت جو نتيجو آهي. پاڻ جلد ئي پوءِ 2 رمضان المبارڪ 1392ھ مطابق 11 آڪٽوبر 1972ع ڌاري اربع

ڏينهن وفات ڪيائين. سندس تربت والد سان گڏ قبرستان ظاهر زڪريا ۾ آهي. پاڻ پيءُ جو اڪيلو پٽ هو ۽ سندس ٻه گهر هئا. پاڻ هميشه مخدوم شاه عثمان قريشي جي درگاه جو عقيدتمند رهيو. هو عيد خاندان سميت وڏيري بلاول پيرزادو جن سان گڏ درگاه تي پڙهندو هو.

پير بخش خان ولد ڌڻي بخش خان هن خاندان ۾ سن 1942ع ڌاري پيدا ٿيو. هي صاحب گهڻو رخي شخصيت جو مالڪ هو. هي پنهنجي وقت جو شاه خرچ ۽ هٿ جو سخي زميندار هو. سندس شوق نوابن وانگر هئا. هميشه وقت جي زميندارن وانگر بگي گهوڙو سواري لاءِ هيٺيان رهندو هو. پاڻ سٺو تعليم يافته هو. سندس دوستن جو حلقو به وسيع هو. وقت جي سڀني زميندارن، ڪامورن، پيرن، فقيرن ۽ فنڪارن سان سٺا تعلقات هئا. زمينداري ڪانسواءِ ٻيو رخ به هو، پاڻ موسيقي جو ڄاڻو ۽ وقت جو سٺو شاعر به هو، سندس شاعري جا ڪيترائي ڪتاب پاڻ پنهنجي زندگيءَ ۾ شايع ڪرايائين. جن ۾ بزم بهار سال 1981 ۽ غمگين دل سال 1968ع ۾ شايع ٿيل آهن. سندس شاعري ريڊيو پاڪستان تان فوزيه سومرو ۽ جلال چانڊيو جي آواز ۾ ڳايل آهي. سندس ڪلام جو نمونو هيٺ ڏجي ٿو.

1. گندي نينهن ناتو نپاڻڻ نه آيو  
روئاري سڄڻ پوءِ ڪلاڻڻ نه آيو.
2. نه پاڻ آيا پرين نه ڪوئي قاصد آيو  
الله ڄاڻي الائي ڇا هي سندن رايو.
3. محبت ڪڏهن به مرندي نه آهي  
سڪن يا ڏکن ۾ سرندي نه آهي

. پير بخش جوڻيجي اميري هوندي به فقيري اختيار ڪئي، فقيرن وانگر پنهنجي خيالات ۽ جذبات جو اظهار شاعري ذريعي ڪيو، نه فقط شاعري پر پنهنجي خرچ تي ڪيترائي ڪتاب به شايع ڪرايائين. ان ڪانسواءِ پٽائي جي اوتاري جي ذميواري ۽ خلافت به سندس مٿان هئي. جيڪا پڻ سٺي نموني نپايائين. هن ناياب گوهر آخري عمر ۾ ڪنڊو واهڻ چڏي وڃي خيرپور ميرس ۾ هڪ عام ماڻهو وانگر زندگي جا ڏينهن گذاريا. جنهن جو سبب پاڻ دل جو سخي ۽ بي وفا سنگت هئا. پاڻ سنه 2001ع ڌاري خيرپور ۾ وفات ڪيائين پونئرن ۾ هڪ پٽ علي بخش عرف رمضان فقير ۽ ٻه ڀائر قلندر بخش جيڪو هڪ سيبتو ۽ هڪ روشن خيال خانداني ماڻهو آهي ۽ سندس ٻيو ڀاءُ هادي بخش جيڪو پڻ استاد آهي. ڪنڊو واهڻ ۾ اڄ به رهن ٿا ۽ پٽائي جي اوطاق جي خدمت ڪن ٿا.

**كهاٲيون / فلئيش فكشن**

## زھرا

ماءُ جي ھنج ۾ ننڍڙي زھرا رڳونديڙا نيڻ ڪڍي ماءُ کي پئي ڏنو. عمر ۾ رڳو ھڪ سال، قدرت مٿس مھربان ڪان ھئي تڏھن تہ پيءُ ھڪ حادثي ۾ فوت ٿي ويو ۽ زھرا ۽ سندس ماءُ نوران کي زماني جي درياھ ۾ زندگي، جي ٻيڙي وڃ وھڪري ۾ ڇڏي جھان ئي ڇڏي ويو. مٿان بيماري، ھئي سندس ھڏ ئي ڇيڪائي وڌا ھئا. کيس الڪو پنھنجي ڌيءُ زھرا جو پنھنجي منھن پٽڪي ٿي

”ساھ جو سڳونہ ڄاڻا ڪڏھن ٿيندوم، هيءُ ٻالڪڙي جھان جو روڻ ڪئين جھاڳي سگھندي.“

اڪين مان لڙڪ وھي پيس. اگھڻ جي ٿي ڪيائين تہ قدمن جي وڌڻ جو آواز محسوس ڪيائين. سندس ڏيرخانڻ اچي مٿس بيٺو رکيو آواز ڪوئيءَ ۾ ٻُريو.

”پاڄائي — هي ڪجهه ڪاڳراھن. انھن تي تنھنجو آڱوٺو لڳندو.“

”ڇا ڪاڳراھن؟“

”عورتن کي مردن کان سوال ڪرڻ جو حق ناھي.“

”ڇو عورت جانور تہ ناھي چونہ ڳالھائي؟“

”رٿا جواب ٻڌڻ کون آيو ھان.“

”پوءِ ٻڌائين چونہ ٿو ڪاڳر ڇا ڇا آھن؟“

”ادو تہ دنيا ۾ رھيو ڪون ڪمھلومري ويو. چار ٻارا زمين جا آھن

ٻيو تہ ڪوپاءُ، نڪوپيڇي سو پنھنجي نالي زرعي زمين ٿو ڪرايان ان

ڪاڳرن براھا ئي لکت آھي تہ تون پنھنجي مڙس جو حصو روٺ نٿي ڇاھين

سڀ ڏيرجي حوالي ٿي ڪرين.“

”ڇو — نيائي جواثر ان جو ڪو حصو پتي ناھي؟“

”پاڄائي ڪھڙيون ٿي ڳالھيون ڪرين. ڀلا ڇو ڪرين جو بہ

ڪو ملڪيت ۾ حصو ٿيندو آھي. ھڃڻي ھا پٽ تہ بيشڪ پنھنجي پاڻي کي

سئون لک ڀيرا ملڪيت جو حصو لکي ڏيان ھا.“



”نياڻيون اولاد ناهن هونديون ڇا.“

”توڪي الائي ڪنهن اهي سبق پڙهايا آهن. ماڻ ڪري ڪاڳرن تي آڳوڻو هئڻ نه ته پنهنجو پنهنجي ڌيءَ جو خير نه سمجه ڪيانو نه ڪهاڙين منجهان.“

نوران ڏيرجي ڌمڪي ٻڌي ڏکي وئي. ڌيءَ زهرا کي سيني سان لڳائي ڇڏيائين. سندس زبان مان رڳو اهو جملو نڪتو ”آڳوڻوڪي هٿو اٿر“

خانڻ کيس ٻڌائيندو ويو ۽ نوران وئي آڳوڻا هڻندي.

زرعي زمين سرس هين پاڻ به پاڻر خانڻ وڌو هئو. سندس ننڍپڻيءَ حادثي ۾ فوت ٿيو ته اها چئون ڇون سڀاڻن ۾ پئي هلي ته خانڻ اهي لالچي ماڻهون ملڪيت جي لالچ ۾ ڪٿي پاءُ جو سر نه ڪٽايو هجيئن. اهڙي ٻاٻورنوران جي ڪنن تائين اچي پڳي هئي پر مٺي به ماڻ مٺي به ماڻ ڪا مزاحمت ڪري ها ته کيس خبر هئي ته سندس ڏير اثاڻو وارو ماڻهون آهي. سندس وجود ۽ ڌيءَ اڳ ئي خانڻ پاڻ تي بار سمجهي ٿو. کيس آس هئي ته مڙس جي ملڪيت آهي ڌيءَ ۽ منهنجو گذر سفر سولو ٿي پوندو پر ڪاڳرن تي آڳوڻو هئي پنهنجي ملڪيت تان هٿ ڪڍي ڇڏيائين. نوران جي گهر ۾ حيثيت هڪ نوڪريائيءَ واري ٿي پئي. خانڻ جي زال به ڪائونس سڄي گهر جوڪر وڻندي هئي. نوران بيساريءَ ۾ ورتل هئي پر گهر جوڪر ڪارڪندي منهن تي گهنج ڪان آڻيندي هئي. نوران مٿان ڏير خانڻ جو جبر جاري رهيو. سندس ڏير يائي ڪٿ ڪان هيٺ پير نه لاهي ڪڪ پڇين پيشو نه ڪري تنهن هوندي به مٿس ڪاوڙ ڇاڪر پيا گجندا هئا. ههڙي قسم جا جملا باز بڻجي جسر تان ماس پٽي وڻندا هئس.

”نڀاڳي آهين. مڙس کي ڪاٺي وٺين ته تڏهن ته ويچارو حادثي ۾ مري ويو. رنڻ آهين منهنجي گهر ۾ نحوست ٿي ڦهلائين. مٿان تنهنجي اها نڀاڳي چوري زهري ڄمڻ سان ئي ندوري نڪتي. پنهي مان اڙي آهيان. ماڻهن جي مڙس جو خوف نه هجي ها ته ڪڏهن ڪو گهر مان ڪڍي ڦٽو ڪيانو ها.“

نوران ڪئين پيرا گهر کان نڪري وڃڻ جي ڪئي پر ڌيءَ زهرا جي ڪري پير گهرجي ڇانڻ کان ٻاهر ڪون ٿي ڪڍيائين. ڌيءَ زهرا سان گڏ خانڻ جي ٻن پٽن ۽ هڪ ڌيءَ جي پر گهورل هئي پوندي هيس. جيڪي دادلا هيا. خوشي جو ڪو به ڏڻ اچي نوران ڪا به فرمائش ڪان ڪندي هئي. جيڪي

ملندوهئس قبول ڪندي هئي. زهرا ننڍي هئي کيس اهڙيون ڳالهيون ڪون سمجھ ۾ ايندويون هيون ته ماءُ کان پڇندي هئي.

”امان ڇاچي، جا ٻار ڪيڏا نه سٺا ڪپڙا ٿا پائڻ ٿا مونکي به اهڙا لٽا وٺي ڏي نه“

اهڙين ڳالهين تي نوران روئي پوندي هئي ته زهرا جا معصوم جملاهوندا هئا.

”ڇو ٿي روئين امان. نه رواجي ڪجهه کان گهرندس.“

زهرا سمجھ ڀري ٿي وئي ته کيس سموري ماجرآ سمجھ ۾ اچي وئي. هڪ ڀيري رڌڻي ۾ ٿانو پئي مليائين ته ڇاچي آيس.

”جود ڪر ڪپڙا به ڏوٽا ٿي گسڪان ڪم نه وٺ“

”ڇاچي ڪم ڪيان ته پئي گس ڇوڪندس.“

”اڙي هيڏي چوري ورنديون ٿي ڏئين. شرم ڪر ڪاڪڙو نه ڪڍي ڇڏيان.“

ائين چئي زهرا کي زوردار چماٽ وهائي ڪڍيائين مٿو وڃي پٽ سان لڳس. ڇاچس هلي وئي هو، روئندي رهي. ماٿس جا بيماريءَ جي بسترتي هئي اٿي آئي. زهرا جي مٿي تي پيارپريو هٿ جو رکيائين ته اچي سڌڪن ۾ پئي سندس ڳوڙها رڻي جي پلوسان اڳهندي ماٿس چيس.

”انهن ئي ڏينهن کان پئي ڊنس ته تنهنجي مٿان ظلم ٿيندي نه ڏسان. بيوس ماءُ، تولا ڪجهه به ڪري نٿي سگهي.“

هنن پاڻ ۾ ڳالهايو پئي ته خانڻ جي زال آئي ڇوڻ لڳن

”ڇا تي ڪٿي ماءُ ۽ ڏي، روج راڙو لڳايو آهي. جڏهن ڏس نڀاڳيون پيون ٿيون سمن وري الائي ڪنهنجوسرڪنديون ڇپ ڪيو ٿيون يا وجهان ڏنڊي ۾ هٿ.“

نورا روئڻهارڪي لهجي ۾

”تون به ٻارن کي ٿي مارين ڪوڪهڪا، ڪر.“

”زهري ٻار آ ڏگه ٿي وئي آ ڪم کان ٿي تڏي. مٿان وري ڀرتي

ڪٿيس. چوري ڪم کان ڪيڏو ٿي لنوائي.“

”کان ٿي لنوائي سڄي گهرجوڪم ته ڪري پئي.“

”مائي تون — ٽي، جي پاس ته ڪندي، ني هڪ تنهنجي بيماري مان

ٻيو ان چوري، مان اڙيا آهيون.“

ائين چوندي خانڻ جي زال هلي وئي.

ماءُ ڏيهر روندي پاڪرين پئجي ويو.

ماء جي پيرسنيءَ سبب گهرجوساروڪم زهرا پاڻ ڪندي هئي ۽ وقت بچائي ماءُ جي به سارسنڀال لهندي هئي. وقت تي دوا درمل ۽ ماني ويلي تي ڪارائيندي هئي. مائٽس صفا ڪمزور ٿي وئي هئي. هلڻ ڦرڻ کان لاچار هئي.

خانڻ ڪجهه ڏينهن کان ٻاهر شهر وٺي هئو جتي سندس مائٽ رهندا هئا. زهرا گهرجي اڳڻ مان ٻهاري پئي ڪڍي ته خانڻ گهر ۾ داخل ٿيو سندس پيرسان لنگهي ويو پر زهرا ڏانهن اک ڪڍي به ڪون ڏنائين. ورائندي ۾ جيئن ئي پهتو ته کيس سندس ٻه پٽ ۽ ڌيءُ چنبڙي ويون. خانڻ به کين ڳل لائي چمندور هڻيو. زهرا حسرت ڀري نگاهه سان کين ڏسندس رهي. خانڻ جي زال منهن تي مرڪ آڻي پاپوهه مان مڙس کي پليڪار ڪيو. هي منظر ڏسي زهرا کي پنهنجو پيءُ ياد اچڻ لڳو سوچڻ لڳي منهنجو به بابا زندهه هجي ها ته آءُ به ساڻس انگل آرا ڪيان هاڻ ڳل لڳي پاڪيون پايان هاڻ. بابا سائين تنهنجي هجڻ سان سنسار سهڻو لڳي ها پر تون ناهي ته هر شيءَ ڪو جهي ٿي لڳي. هتي امان ۽ منهنجو ڪوئي حال پائي ناهي. ائين سوچيندي زهرا آسمان طرف سواليا نظرن سان ڏٺو. آسمان تي ڏور ڪا گجهه ڏوندي جي ڳولا ۾ هئي.

زهرا جي ماءُ سخت بيماريءَ ۾ خانڻ به سندس علاج طرف ڌيان ڪون ڏنو نيٺ چڙي چڙي مري وئي. زهرا ماءُ جي پيرن کي پڪڙي روئي پار پئي ڪڍيا.

”او امان ڪنهنجي سهاري ٿي ڇڏي وڃين. مون کي به ساڻ وٺيو هل هتي توکانسواءِ منهنجو ڪير آهي. ڪنهن سان ويهي سورسليندس دل جون ڳالهيون ڪندس.“

خانڻ لوڪ جي لڄ کان زهرا کي ڪوڙا دلاسا پئي ڏنا. وقت جي پرواز تي ڪير ٿو چار اچي قابو ڪري سگهي. نوران جي جسر جو مٽيءَ جو پنوڙو وڃي مٽيءَ سان مليو. سندس ڌيءُ زهرا ٻالڪ پڻ مان جوانيءَ طرف پيرسوري ورتا ته سندس هر عمر سئوٽ به جوان ٿي ويا. زهرا سونه ۾ خانڻ جي ٻارن کان سرس جيڪا ڳالهه سندس چاچيءَ کي هڪ اک نه پائين زهرا مان وڌون پئي ڪڍندي هئي. زهرا سئوٽن جو پورو پورو خيال رکندي هئي. وقت تي ماني ڪارائڻ، ڪپڙا ڌوئڻ پائي پيارڻ هر ڪم سندس ئي زمي هئو. گهرجي صفائي سترائي کان ويندي رڌ پچاءُ تائين کيس ئي ڪرڻو پوندو هئو. خانڻ جا پٽ به اچي جوانيءَ چڙهيا. زهرا کي محسوس ٿيو ته خانڻ جو وڏو پٽ سهيل کيس ڪڏهن اڪيلائي



جوفاندووني تنگ ڪندي عجيب حرڪتون ۽ اشارا ڪندو هئو. زهرا کيس گاهه ئي نه وڌو ته هومچرجي پيو. کيس جنسي طور به هٿ چراند ڪرڻ شروع ڪئي زهرا ڪنهن کي دانهن ڏئي. پُل جي هيٺان گهڙوپائي وهي چڪو ته زهرا مجبوري وچان چاچي، کي دانهن ڏئي ته سهيل تنگ ڪري ٿو. چانچس ڪاوڙ ۾ ڳاڙهي ٿي وئي چئي ”چوري منهنجي پٽ مٿان الزام ٿي هئي مارپوي ڪا، جواني چڙهي ٿي ته منهنجي پٽ تي غلا ٿي آئين“ کيس سوئي ڏيکاريندي چيائين ”خبردار جوهرڪ ٻاهر ڪڍي اٿي. چاچهن کي نه خبر پئي ڪهاڙين مان ڪڍندئي.“

”پوءِ سهيل کي سمجهاءِ نه اهڙيون حرڪتون چوڻو ڪري.“  
 ”چوري وات تي هئي.“

زوردار به ٿي سوتيون چانچس پٺن تي وهائي ڪڍيس ته سهيل مار کائيندي زهرا کي ڏسي مرڪي رهيو هئو. ۽ زهرا دانهون پئي ڪيون زهرا وڌيڪ مار جي ڊپ کان پنهنجي ڪمري ۾ هلي وئي سندس ڪمرووري ڪهڙو هئو. هڪ چنل ڪٽ، ۽ ٻه پرائيئون رليون، هڪ وهائو ڪجهه کائڻ پيئڻ جان ٿانو، ڪمري ۾ رُگهه مارڪائي ڪٽ تي اچي پاڻ ڦٽوڪيائين سندس پنا سور کان ڏکي رهيا هئا.

خانڻ جي گهر شهر کان سندس پري جا مائٽ آيل هئا سندن زرعي زمين خانڻ جي زمينن سان گڏ هئي جيڪي پنهنجي پٺي ٻاري جي سنڀال لاءِ خانڻ جي گهر ايندا رهندا هئا. گهر ۾ رونق لڳي پئي هئي زهرا ڪم ۾ جڳيل مهمانن جي ڪري مٿس ڪم جو بارسرس پئجي ويو هئو پرفرحانه جا پنهنجي پيءُ ماءُ ۽ ڀاءُ سان گڏ آيل هئي سا سندس پرجهلوڻي پئي. پنهني ۾ ساهيڙپ وڌي وئي. زهرا ماني پچائڻ لاءِ اٿو پئي ڳوهيو جو فرحانه وٽس آئي کيس چوڻ لڳي.

”گهر جو سڄو ڪم ڪارڪڻي مٿي ۾ هيوائتي. جيڏي مهل ڏس ڪنهن ڪم ۾ لڳي پئي آهين. مٿان ڪير به پيارجي نگاهه سان ڪون ٿو ڏسئي چاچي، کي ته هڪ اک به ڪان ٿي پائنجي سندس ڌي ڪٽ کان هيٺ پيرڪان ٿي لاهي پنجاهه جي نوٽ تي پير رکي ٿي هلي ۽ تنهنجو سڄو چاچو به مان ڪون ٿو ڏسي ۽ تنهنجا سئوٽ بي لچا پيوڻا مانئون ڳرن نڪي کائڻ جو افعال نڪي ڳالهائڻ جي تميز ڇڏا ڪنهن جاءِ جا



اٿو ڳوھ ته ماني مان ٿي پڇاڻان.“  
 زهرا ڏيمي لهجي ۾ چيو  
 ”نه - چاچي ڪاوڙ ڪندي.“  
 ”چوڪاوڙ ڪندي. الڪو نه ڪر پاڻ جواب ڏيندي مانس.“  
 ڳوھيل اٿو فرحانه پاڻ ڏي سيري ماني پڇاڻڻ شروع ڪئي ته زهرا  
 پاڇي چاڙهڻ شروع ڪئي. رڌڻي ۾ ڳالھيو به ڪندي فرحانه چيس ته  
 ”ڪجهه وقت لاءِ شهر گڏجي هل ڪي گھڙيون ته سڪون جوساھ  
 ڪن.“

”نه - مون ڪي منهنجي حال تي ڇڏي ڏي“  
 ”پنهنجون ٿي سمجهي ڇا.“  
 ”تون ته ساھ ۾ سانڍڻ جهڙي آھين چاچي ۽ چاچو اصل موڪل  
 ڪون ڏيندا انهن کي نٿي سڃاڻي اٿو ڪاوڙ ڪندا ته زهرا ئي فرحانه کي  
 شھروني هلڻ لاءِ زور ڀريو هوندو. تون ته هلي ويندي، هي منهنجو هڏ گڏ  
 هڪ ڪري ڇڏيندا.“  
 ”ڇا توکي ماريندا به آهن.“  
 ”ڪون نه ڪوبه انوناهي ڪٽيندا رهندا آهن.“  
 ”او خدايا! وڏا ظالم آهن ويچار ڇوري چني، تي ڪهڪاءُ به ڪون  
 ٿو اچين“

”آهستي ڳالھ چاچي ٻڌي نه وئي.“  
 ”پلي ٻڌي مان ڪو ڊڄانس ٿي ڇا؟“  
 ”تو کي ڪجهه ڪون چوندا منهنجي لاءِ ويل ٿيندو.“  
 ”واعدو ڪر ته شهر هلندي، موڪل وٺڻ منهنجو ڪم آهي.“  
 ”جي موڪل ڏيندا ته چونه هلنديس.“  
 ”بس اهو ڪم مون تي ڇڏي ڏي.“  
 زهرا شهر پهچي سڪون جوساھ ڪنيو. فرحانه جي گھڙپاڻين جي  
 قرب سندس اندر ۾ خود اعتمادي ۽ محرومي ختم ڪئي. وٽر فرحانه جوڀاءُ  
 کيس ڏاڍو پائڻ لڳو هئو ته من موج ۾ اچي ويو هئس کيس لڳو ته زندگي،  
 جون رونقون ۽ رنگينون به آهن. شهر ۾ رهي صاف سٿري بلي بلي ٿي  
 نڪري پئي هئي آئيني سامهون ايندي هئي ته پئي آئيني کان سوال ڪندي  
 هئي ته مان ساڳي زهرا آهيان يا ڪا ٻئي چوڪري جوڀن جوا حساس کيس  
 هتي ئي ٿيو هئو. زهرا ۽ فرحانه ڪمري ۾ ڪچهري، ۾ هيو جو فرحانه جوڀاءُ  
 سليم ڪمري ۾ آيو. زهرا کيس ڏسندي ئي لڄاري ٿي وئي. ساھ ۽ دل

جودهڪوتيزڻي ويس. سليم ڪرسيءَ تي ويهندي پيڻ سان مخاطب ٿيندي چيو ته

”ادي لشبرري، ويوهيس ٿڪ ٿو محسوس ڪيان ڇانهه ته پيارير.“

”اجهو ٿي ڇانهه ٺاهي اڃان.“

فرحانه اٿڻ جي ڪئي ته زهرا به اٿي ساڻس هلڻ جي ڪئي پر فرحانه منع ڪيس هو، هلي وئي ته سليم ۽ زهرا اڪيلا ٿي پيا. ڪا دير خاموشي رهي. سليم زهر طرف نهاريندي چيو

”توهان ايڏا خاموش چورهندا آهيو هتي ته اوهان کي ڪا جهل پل ٺاهي ڪوڀو ڪونهي خوش رهندا ڪيو.“

زهرا جي زبان تي ڪي من ٻارڻجي ويو چڻو جو اٿلي.

”مون کي خبر آهي اوهان جي زندگيءَ ۾ ڪهڙو ڏک وڌيڪ آهي. توهان سٺا لڳندا آهيو تڏهن ئي ڪجهه گهڙيون ڪچهري ڪرڻ اوهان وٽ ايندو آهيان پر توهان رڳو چپ.“

”ڇا ڪيان گهٽ ڳالهائڻ جي عادت پئجي وئي اٿر.“

”ڪا ڳالهه ٺاهي آهستي سڀ ٺيڪ ٿي ويندو.“

فرحانه سڀني لاءِ ڇانهه ٺاهي ڪئي آهي. ڇانهه جودرو به هليو ته ڪچهري به ٿي. سليم ۽ زهرا جي وچ ۾ حجابن جا پردا آهسته آهسته سرنڌا ويا. ويجهڙا پٽ وڌندي وئي. زهرا کي پهريون ڀيرو زندگيءَ ۽ جيئري هجڻ جو احساس ٿيو ته ڇاچي جي گهر ۾ ته سندس زندگي جانور جيئن ٿي گذري جيون جي رونقن کان خالي خالي. فرحانه جا ماءُ پيءُ به کيس گهڻو قرب ڏئي رهيا هئا. زهرا ۽ فرحانه ڏٺي ۾ هيون جوماني تيار ٿي ته فرحانه چيس

”ماني ڪشي امان ۽ بابا جن کي ڏئي اچ.“

زهرا ماني تري ۾ ڪشي جيئن ئي ڪمري جي ويجهو پهتي ته کيس

فرحانه جي ماءُ جو آواز ٻڌڻ ۾ آيو پاڻ اوت وڻي بيٺي رهي.

”سليم جا پيءُ ڳالهه ڪرڻي هير توسان“

”ڇڻو ڪهڙي ڳالهه آهي.“

”زهرا ڏاڍي سلڇڻي چوڪري آهي. ڪم ڪار ۾ پڙ وڌي ننڍي

جو خيال منهنجي ته دل ۾ گهري وئي آهي چون پٽ سليم جي لاءِ ادي خانڻ

وارن کان زهرا جي سڱ جي گهر ڪيون“

”ها - اهو خانڻ آهي گهرو ۽ لالچي ماڻهون چيو مڃيندو اٿئي

ڪون.“

”چون ۾ ڪوهرج ته ڪونهي“  
”جيڪا تنهنجي مرضي.“

ٿوري دير لاءِ خاموشي ٿي وئي ته زهرا ڪمري جو در ناڪ ڪيو ۽  
پردوسي ڪمري ۾ اندر هلي آئي. ماني ٽيبل تي رکيائين ته سليم جو پيءُ  
کيس اڳ کان وڌيڪ پنهنجائپ جي نگاهن سان پئي ڏٺو. زهرا لڄاري ٿي  
وئي ۽ پوئتي پير ڪيائين. ردڻي ۾ آئي ته سندس ڪيفيت عجب هئي. دل  
جودهڪو تيز ۽ چهري تي خوشي، گاڏڙ تائڻ هيس فرحانه کيس ڏٺو ته هو،  
به سوچ ۾ پئجي وئي. ۽ پڇي وينس  
”ڇا ٿيو.“

”ڪجهه نه بس ائين ئي.“  
”چري مون کان ٿي لڪائين. تنهنجو مڪڙو ڪجهه ٻڌائي رهيو آهي.“  
”چير نه ڪجهه ناهي.“

ائين چئي زهرا وڏيون وڏيون وڪون ڪندي فرحانه جي ڪمري ۾  
هلي وئي ته فرحانه سوچڻ لڳي

”الائي امان ڪهڙي خوشيءَ جي خبر ٻڌائي اٿس جو ٻهڪي پئي.  
نيڪ آهي پياري ساهيڙي خوش رهي ويڃاري، ڪوڙڌڪ ڏنا آهن.“

رات پهرين پهرين ننڊاڪڙين اکين ۾ زهرا جو مرڪز سليم ئي  
هئو. ڪيترائي سوال جن جا جواب وٽس ڪونه هئا منهنجو چاچو چاچي ڪڏهن  
به سليم جو ٿيڻ نه ڏيندا. هووڻڻ لڳو اتر جيڪڏهن سليم جي لاءِ  
منهنجو سڱ چاچي جن کان گهريائون ته ويترمون لاءِ ويل وڌي ويندو. اهي  
چاهيندا ته سندن جوان ڌيءَ جي هتي خوشحال گهر ۾ مٽي ٿئي. انسان جي  
وس ته ڪجهه به ناهي جيڪو قسمت ۾ هوندو سو ٿيندو. پورپچائڻ مان  
ڪهڙو هڙ حاصل ٿيندو. الا! ڇاڪيائين ننڊ به ته نٿي اچي نه - مٿي الائي  
ڪهڙي رڻ ۾ رلهي وجهي سمهي پئي آهي. اڄ ننڊ اڄ هو، ننڊ ڪي سڏ ٿي  
ڪري. اڌ ننڊ اڌ جاڳ ۾ رات گذري وئي. ٿڪل بت سان اٿي فرحانه ڏانهن  
هلي وئي جا ردڻي ۾ نيرن تيار ڪرڻ ۾ رڌل هئي.

زهرا ۽ سليم جي وچ ۾ پيارو ڏندو ويو ڪي قرب  
واريو ڪچهريون به ٿيون. هڪ ڏينهن زهرا جو چاچو چاچي پهتو زهرا کي  
واپس پنهنجي ڳوٺ وٺي آيو. پر سليم جي محبت سندس پيروڪنيو گهڙتائين  
اچي پڳي. گهرجو ڪم ڪار ڪندي هروقت تن ۾ تانگهه سليم جي ئي هيس.  
رات جي خوابن جا منظر ٿي بدلجي ويا. هٿن تي ميندي لڳل پاڻ ڪنوار جي  
روپ ۾ سليم سان گڏ مينديءَ جي خوشبوءِ اڪيلائي جسم ۾ سياتو اڀرندي

ٺي خوابن مان حقيقت جي دنيا ۾ هلي ايندي هئي. سارو ڏينهن ته گهرجي  
ڪر ڪار ۾ لڳي پئي هوندو هئي رات ئي کيس پنهنجي پيار جو پيسار پئي  
ڪرائيندي هئي هو، گهڻو خاموش رهڻ لڳي هئي چاچي، جو ظلم ته جاري  
رهيو پر ڪنهن جي دل ۾ جاءِ جوڙڻ کانپوءِ کيس آتڻ ٿي پيو هئو ته سڻاوا  
ڏينهن اچڻ وارا آهن. زهرا ۾ آيل بدلاءَ کي سندس چاچي، محسوس ته ڪيو  
هئو ته جڏهن کان شهر کان موٽي آهي ڇپ ڇپ ٿي رهي ماريانس ڪٿيانس،  
تڏهن به سڀ سهي ٿي وڃي ڪا ماجرا ضرور آهي. زهرا کي سڏ ڪيائين.

”اوزهري هيڏ ته اڃ“

”جي چاچي اڃان ٿي“

”ها جود ۾ اڃ“

زهرا چاچي، جي ڀر ۾ اچي بيٺي.

”چوري ڏي ته خبر جڏهن کان شهر کان موٽي آهين ڇپ ڇپ ٿي  
رهين. مارمو جوڙو ٿي ڪيان، تڏهن به ماڻ ۾ آهين تنهنجي طبيعت ۾  
بدلاءَ اچي ويو آهي شهر وڃي ڪهڙا ڪيڇڪ ڪيا ٿي ڪنهن سان ناتو  
جوڙيو ٿي.“

”نه چاچي اهڙي ڪا ڳالهه ڪانهي.“

”اسان کي به ڪڙڪ پوندي پوءِ ڪيندڻي چاچهن ڪهڙي، مان. هئين  
اسان مٿان وڏو ٻوجھو آهين بهاني سان جان آجي ٿي پوندي.“

زهرا ماڻ ۾ رهي چاچهنس چيو

”وڃ ڪم وڃي ڪر باقي تنهنجي چال ٻڌائي ٿي ته دال ۾  
ڪارو آهي.“

زهرا گهرجي اڳڻ ۾ ٿانوپڻي مليا ته گهرجي دروازي تي ٺڪ ٺڪ  
ٿي زهرا جي دل جودهڪو وڌي ويو. لڳس ته سليم آيو آهي. خانڻ جي پٽ  
وڃي دروازو کوليو ته سليم بيٺو هئو کيس اندر گهر ۾ وٺي آيو. هن سان  
سڀ مليا. خانڻ ۽ سندس زال سليم کان ماءُ پيءُ جو حال احوال وٺڻ شروع  
ڪيا زهرا سليم جو آواز ٻڌو ته هٿ ٿانوملڻ کان ٿي بيهجي ويس. پنهنجي  
پاڻ تي نظر ڪيائين حال ته بچڙا لڳا پيا آهن. اندر وڃي پيو نه ڪپڙا ته  
مٿائي وٺان صفا ميرا لڳا پيا آهن هوءَ اٿي ڪمري ۾ هلي وئي جلدي، ۾  
ڪپڙا مٽيائين رڳو وارن ۾ ڦٽي ڪيائين مٿان چاچي، کي شڪ نه پئجي  
وڃي اڳ ئي ارديون پچائون ڪري چڪي آهي. جلدي جلدي ٿانون ملڻ  
واري جاءِ تي پهتي ۽ ٿانون ٽڪڙ ۾ ڌوئي ورتائين. ايتري ۾ سليم به  
چاچهنس سان گڏ اڳڻ ۾ ڦيرو پاتو. زهرا کي سلام ڪيائين جنهن ڪنڌ هيٺ



ڪري ئي سلام جو جواب ڏنو. هجت واري انداز ۾ زهرا کي چيائين  
”ڪيئن آهين، نيڪ آهيو نه.“  
”ها ها نيڪ آهيان“

پوءِ سليم ۽ زهرا جي چاچي ڪمري ۾ هليا ويا جتي هن کي  
چاچهنس ڇڏي ٻاهر آئي. ان وقت زهرا ردڻي ۾ هئي چاچهنس آيس ۽  
چيائينس  
”مهمان لاءِ ماني تيار ڪر.“  
”جي ها ڪيان ٿي.“

ائين چئي چاچهنس هلي وئي. خانڻ ۽ پنهنجي ڌيءُ پٽ سان  
ڪچهري ڪرڻ لڳا. زهرا لاءِ ان کان وڌيڪ ٻي ڪهڙي خوشيءَ جا ڳالهه  
هئي جو پاڻ پنهنجي پيارڪندڙ کي هٿن سان ماني تيار ڪري ڪارائي. ماني  
تيار ٿي ته پاڻ ڇا چي، ڏانهن هلي وئي کيس ٻڌايائين ته ماني تيار آهي.  
چاچهنس چيو ته ”اڄ ڪمري ۾ ماني ڪٿي اسان سڀ سليم سان گڏ ماني  
ڪائينداسين.“

زهرا مرڪندي ورائي ڏنس ته  
”اجهوڪڻي آيس.“

سڀ گڏجي ماني کائڻ لڳا ته زهرا سندن خدمت لاءِ اپ پير بيٺي  
رهي. جئين ڪنهن به شئي جي ضرورت پوي ته ترت کين ڏئي سگهي.  
سليم خانڻ ۽ سندس ڪٽنب سان ڪچهري به پئي ڪئي ته ماني به پئي  
کاڌي ڪڏهن ڪڏهن زهرا تي به پئي نهار ڪيائين. خانڻ جي ڌيءُ سليم  
سان پوڳ چرچا به پئي ڪيا. زهرا جي چاچيءَ کي سنوڀڻي لڳو ته سندس  
ڌيءُ پلي سليم جي ويجهو ٿئي ته جئين سندن گهرائپ وڌي ۽ مٽي ڪرڻ ۾  
آساني ٿئي. جيڪو زهرا کي زهر ٿي لڳو ته هو، سليم سان هجائتي چوڻي  
ٿي پر پاڻ تي قابو ڪيون ٿي آئي. سليم به زهرا کي مزاح واري انداز ۾  
پئي ڏنو. ماني پوري ڪري سڀڪو هٿ ڌوئي اچي ڊرائنگ روم وينو ته  
زهرا کاڌي جا ٿانوسهيڙي چانهه ٺاهڻ کي لڳي وئي.

چانهه تيار ڪري ٿري ۾ رکي ڪٿي آئي سڀني کي چانهه ڏئي ڪنڊ  
وٺي هو، به ويهي رهي. زماني جون ڳالهيون پئي هليون خان محمد ۽ سندس  
زال، ڌيءُ، پٽ سليم سان ڪچهريءَ ۾ لڳل رهيا. چانهه پوري ڪري خان  
محمد اٿڻ جي ڪئي ته سندس زال به ڪمري تائين هلي وئي. زهرا ڪوپ  
ڪڍڻ لڳي. سمورا ڪوپ ڪٿي ردڻي ڏانهن هلي وئي ته خانڻ جا پٽ به اٿي  
ويا خانڻ جي زال واپس موٽي آئي. ڪجهه پاڻ ۾ ڪچهري ڪيائون ته تيسن

زهرآ ڪوٺ ڏوئو واپس، موٽي آئي. اچي ويئي ته سندس چاچي کيس گهور  
ڪري ڏسڻ لڳي زهرآ تڏائيندي رهي آخر کيس چاچي چيو هل ته ڪمري ۾  
سليم جي سمهڻ لاءِ ڪمرو کي ٺاهيون.

سليم انتظار ۾ هئو ته زهرآ سان اڪيلائي ۾ ملاقات ٿئي. پر هو،  
هروقت ڪم ۾ رڌل نيٺ رڌي ۾ لنگهي ويو زهرآ چرڪي پئي.

”چوهتي آيو آهين ڪير ڏسي وئي ته“

”چاٿي پيو. ڪجهه ڪون ٿيندو“

”تو کي ڪير ڪون چونڊو ڀرمون لاءِ ويل ٿي ويندو.“

”ٻڌ. امان بابا جلد تنهنجو سڱ گهرڻ لاءِ چاچا خانن جن وٽ ايندا.“

”هان - خدا ڪري ها ڪن“

”نه ڪر ڪون ڪندا.“

ائين چئي سليم زهرآ جو سڄو هٿ پڪڙيو ۽ پاڻ طرف ڇڪي  
ويجهو ڪيو ۽ سندس هٿ جي پٺي تي چمي ڏني ته زهرآ کان درهڙي  
پرچي وئي هٿ ڇڏائي رڌي کان ٻاهر هلي وئي. سليم رڌي مان نڪري  
ڪمري ۾ آيو. پورا ٻه ڏينهن سليم رهڻ کانپوءِ موڪلائي شهر هليو آيو. هو  
ته هليو ويو ساڻ زهرآ جو چين، سڪون سان ڪشي ويو پوئتي ڇڏيو ويو  
انتظاري ۽ بيقراري. زهرآ ڪيلائي، ۾ ور ور ڪيو پئي ساڄي هٿ کي  
ڏسي جتي سليم چمي ڏني هيس. ان جاءِ تي هٿ ڦيرائين کيس سڪون ٿي  
آيو ۽ پوءِ پنهنجا چپ اتي رکي ڇڏيائين.

سليم جو پيءُ نور محمد اچي خان محمد جي ڳوٺ پهتو گهريائين  
سندس آءُ ڀڳت ڪئي، پلي ڪار چئي. ڪجهه ٿي وقت ڪاٺور ٿي اڏامي  
ويو. رات جي ماني کانپوءِ ميلو متل هئو. نيٺ هڪ هڪ ٿي سيڪوائنڊيو.  
آخر ۾ خان محمد ۽ نور محمد وڃي رهيا. هيڏانهن هوڏانهن جون ڳالهيون  
ڪندي. نور محمد چيو ته

”ادا خان محمد تڪڙو آهيان سڀاڻي واپس هليو ويندس. سو ڳالهه  
ڪرڻي هير“

”ڇوڪا خاص ڳالهه آهي ڇا.“

”ادا - پاڻ ۾ ويجهو عزيز آهيون. زماني جي دستور آهي پڪي پير ۾  
هر ڪوپيو جنپ هڻندو آهي“

”ها ادا نور محمد اهو ته سچ آهي ان کان منهن موڙي سگهيو ڇا.“

”ادا. سليم پٽ جي شادي ڪرڻي اتر جيڪر توهان اسين ڳنڍجي  
ويون منهنجو مطلب آهي مٽي ڪيون ته بهتر ٿيندو.“

خان محمد خوش ٿيندي اهو سوچيو ته نور محمد سندس ڌيءُ جو سڱ پيو گهري. سو گد گد ٿيندي چيائين  
 ”ها ادا ڇو نه پنهنجا پاڻ ۾ آهيون مون کي توهان سان رشتي ڪرڻ تي ڪوبه اعتراض ناهي.“  
 ”ته پوءِ ها سمجهان“  
 ”ڇو ته ادا.“

”پرياجائي ڳالهه مڃيندي الائي ڪون.“  
 ”ڏس نور محمد زبان مرد ڪندا آهن. ان کي پاڻي به مرد ئي ڏيندا آهن عورت جو ڪم ناهي ته وچ ۾ تنگ اڙائي“  
 ”ته نيڪ آهي مان زهرا جي سڱ جي توهان کان گهر ڪيائڻو. اسين هفتي اندر اچي مڱڻي ڪري شاديءَ جي تاريخ رکي وينداسين. توهان جي وڏي مهرباني.“

خان محمد جي منهن جو پنو ئي لهي ويو. پاڻ سوچيائين ٿي ته سندس ڌيءُ جي نور محمد گهر ڪندو پري ڳالهه ئي ابتي ٿي پئي. سڪيون ڳيتون ڏيندي پاڻ کي سنڀاليندي ڇوڻ لڳو ته ادا مون ڪجهه پيو سمجهون هئو ته منهنجي ڌيءُ جي گهر ڪندي.“  
 ”ڇو زهرا تنهنجي ڌيءُ ناهي ڇا؟“

”آهي آهي.. چونه پر زهرا توهان جي لائق ناهي.“

”هن ۾ ڪهڙي ڪمي آهي“

”نه نه ڪمي ته ڪائي ڪونهي پر سوچڻ جو موقعو ته ڏي نه“  
 ”ڇڱو سوچي ورندي ڏيڃان. پر جواب ها ۾ هجڻ گهرجي.“  
 ”ها ها سوچي نياپو مڃندو سانءُ“

صبح جو نور محمد موڪلائيندي نڪرڻ جي پئي ڪئي ته کيس ياد آيو ته زهرا کان موڪلاير ئي ڪون اهو سوچي رڌڻي ۾ هليو آيو زهرا جي مٿي تي هٿ اچي رکيائين کيس خرچي ڏنائين مار ۾ کيس چيائين ته جلد تون منهنجي گهر ڪنوار ٿي اينديءَ. ٻاهر نڪري شهر روانو ٿي ويو. زهرا جي خوشيءَ جي حد نه رهي.

خان محمد پريشان رهڻ لڳو هو ته نور محمد کي ڪهڙو جواب ڏئي زال سان صلاح ڪرڻ مناسب سمجهائين. زال کي سموري ڳالهه ڪري ٻڌايائين هوءَ به سوچ ۾ پئجي وئي ڳالهه ته ڳري ٿي پئي. گهڻي ويچار کانپوءِ چيائين ته

”چونه ڪومندو ٿندو ڇو ڪرو ڏسي زهريءَ جي شادي ڪرائي ڇڏيو.“

ندوري گهر ۾ هوندو ته پنهنجي ڌيءَ جو رشتو تيسن کون ٿيندو؟  
 خان محمد مايوسي، منجهه چيو ته  
 ”گهرجو ڪر ڪارڪير ڪندو. توهان گهرياتي ته ڪڪ پيچين پيشون  
 کون ٿا ڪريو.“  
 خان محمد جي زال سوچيندو چيو ته  
 ”هيئن ٿا ڪيون جونور محمد جي جيڪا ٻني اسان جي ٻنو ٻني سان  
 آهي کيس چئون ٿا ته اهان اسان جي حوالي ڪري ته کيس زهرا جوسگ  
 ڏيندا سين.“  
 اهڙي ڳالهه ٻڌي لالچي خان محمد جي واچ گودو هڻي وئي چيائين  
 ”واه جو ڳالهه ڪئي اٿي. ائين ئي ٿيندو.“  
 ۽ ائين ئي ٿيو. خان محمد زرعي زمين جي عيوض زهرا جوسگ  
 نور محمد جي پٽ سليم کي ڏئي ڇڏيو.



## اڙي شهر جانان...

رات ڪنهن هوشيار چوروانگ آهستي آهستي پنهنجي منزل ڏانهن  
سري رهي هئي ۽ هن جي اندر جي لڳل کات جا ڦٽ وري نيئن سر چڪي  
پيا هئا. رات جي سانت چئني پاسي خاموشي ته جي چادر ويڙهي ڇڏي هئي.  
ڪيڏي ڪيڏي مهل ڪٿان ڪنهن ڪتي جي پئونڪ ۽ ڪيڏي مه چوڪيدار  
جي سيٽي، رات جي پوترتا سان رپ پئي ڪيو. رات جي خاموشي هن کي  
سدائين بي چين ڪندي پئي رهي آهي پر اچوڪي رات هن لاءِ شب  
عاشوري بڻجي پئي. سالن کانپوءِ رات جي خاموشي، کي چيري هڪ آواز  
سندس سماعتن سان ٽڪرايو ته سندس من اندر جي ڪهڪشائن ۾ يارن جا  
ستارا چمڪي پيا ۽ پنهنجي محور تان هٽي هڪٻئي سان ٽڪرائڻ لڳا.

اهو آواز ڪٿان اچي رهيو هو. ساهه کيس خبر نه هئي ر کيس اها  
پڪ هئي اهو ورلاپ اڄ کان ويهه ورهيه اڳ سندس سونهن جي شان جو  
قصيدو هو شفيع فقير جي آواز ۾ ”اڙي شهر جانان کي توکي سنڀارون“  
جو ورلاپ اڄ سندس من کي ابتڙي، جي ڦار ڪري رهيو هو. اهو آواز  
فليٽن جي پرين، ونگ سان اچي رهيو هو ۽ فليٽن جي اها ونگ سندس  
بنگلي کان ڪا گهڻو پري ڪانه هئي. آواز ڇا ٻريو ڇڻ هن جي ماضيءَ جي  
وسائل ڇلهه ۾ باهه ٻري پئي ” يقيناً انهن فليٽن ۾ ڪو ڏکي پڙو رهندو  
هووندو“ هن سوچيو. سندس سارو ٿيون ماضيءَ جي رٿ تي سوار ٿي ويه  
هورهيه اڳ واري سنڌيونوڀورسٽيءَ جي آرٽس فيڪلٽيءَ ڏانهن هليون  
ويون. کيس اهو شاعر ياد اچي ويو جيڪو هن جي ڪري فارميسي  
ڊپارٽمينٽ جي ٻاهران سفيدي جي اوچن وڻن جي چانور ۾ سڄو سڄو ڏينهن  
ويهيه سندس شان ۾ ائين قصيدا لکندو هو، ڇڻ ڪنهن مقس محيفي جو  
تفسير لکندو هجي. ميرا ڪپڙا، وڪريل ڏاڙهي قد جو هلڪو ۽ ٿر جي  
اڃايل ڌرتيءَ وانگر سندس اکيون سدائين تازو ٻنيل، چڻهن جي پيار جي  
ڪڪرن مان ڪجهه ڪڍيون ڪرڻ لاءِ آيون هجن.

آواز فليٽن جي پرين، ونگ مان ايا به اچي رهيو هو. هو، سوچن

جي صحرا مان ڪنهن پٽڪيل مسافر وانگر موٽي آئي. هن انهن ساروئين کي پنهنجي چنيءَ جي پلو مان جهٽڪو ڏيئي چنڊن پئي چاهيو پر هر پيري اهي يادون تر جي پرت وانگر سندس روح ۾ چپي پئي ويون ۽ انهن جي ڪهران سندس اکين کي آلو پئي ڪري ڇڏيو.

هو، اتي اچي ڊريسننگ ٽيبل جي آئيني اڳيان بيٺي. کيس پنهنجي مٿي ۾ چانديءَ جون لڙيون نظر آيون. سندس اکين جي هيٺان ڪارا دائرا چٽا هئا. هن عمر جي گواهيءَ کان اڪيون چورائڻ چاهيون پر وقت جي وٿي سندس چهر تي آيل ڪل جي لڪيرن ۾ نمايان ٿي پئي.

”هن بنگلي جي غلام گردش ۾ مونکي بههريهه وهامي ويا؟“ سندس چپن مان هيران پٽڪو نڪتو. هن پٺتي ليٿو پائي چور اکين سان لائونج طرف نهاريو، جتي سندس مڙس شوازيگيل جي بوتل مان وهسڪي گلاس ۾ اوتي رهيو هو. نشي جا مار سندس اکين جي ڳاڙهاڻ جا شاهد هئا هن جهٽڪي سان منهن پيرائي ڇڏيو. سندس چهر تي ناگواريءَ جا تاثر پکڙجي ويا. هن پنهنجي مڙس جي تصوراتي اکرڻ کي پنهنجي اندر ۾ اوتڻ نه پئي چاهيو.

اڙي شهرجانان کي توکي سنپارون،

ته شاعر جون گذريون هتي پنج بهارون.

شفيع فقير جو آلاپ سندس ڪنن ۾ يادن جو پگهريل شيهو پري رهيو هو. هن ماضيءَ جي دري کولي گذريل وقت جي دري کولي گذريل وقت جي اونداهي ڪمري ۾ ليٿو پائڻ نه پئي چاهيو پر اڄ حليم باغي کيس زبردستي ماضيءَ جي انهنوسيلن لمحن ۾ وٺي وڃڻ لاءِ آيو هو، جن مان ماڪيءَ جون مڪيون رس ڪڍي زندگيءَ جو مٺاڻ ٺاهينديون آهن. اڄ سندس ”آسي بي چينيءَ جي آخري منزل کي ڇهي رهي هئي. جيتوڻيڪ هو شاعر کيس بنهه نهوڻو هو ۽ هڪ پيرو هن دل جهلي شاعر کي پنهنجي بوناسيءَ کا روڪڻ لاءِ منتون به ڪيون هيون.“ دل ڪو دشمن جو ديس ته ناهي جنهن کي فوج جي جهجهي تعداد جي ڪري فتح ڪري سگهجي. پر اڄ شاعر جا لفظ سپاهين جي سنگينن کان به وڌيڪ خطرناڪ ثابت ٿي رهيا هئا.

”هي مون کي ڇا ٿي رهيو آهي ۽ اڄ مان هن ماڻهوءَ لاءِ ائين ڇو پريشان ٿي رهي آهيان، جيڪو مون کي وڻندوبه ڪونه هو.“ هو، پنهنجي منهن پٽڪڻ لڳي.

”پلا هن ۾ اهڙي ڪهڙي خاص ڳالهه هئي؟“ سندس مٿو ڇڪرائڻ

لڳو. هو تهبي قرار، مان مٿو پڪڙي خوبصورت بيد تي ڪري پئي .  
ديڪورا جي نرم ۽ خوبصورت بيد جو گاديلو سندس جسم ۾ ٿوهر پوکي  
ويويس ياد آيو . هن هڪ پيري شاعگر سان... ”چاتون مون کي بدنام ڪري  
اڳتي لاءِ سنڌي چوڪرين جي تعليم جا رستا بند ڪرڻ چاهين ٿو؟“

”نه محترم سان سنڌي چوڪرين جي تعليم لاءِ پنهنجي دل جي  
قرباني ڏيئي سگهان ٿو؟“ شاعر اڪيون هيٺ ڪري ڇڏيون پر سندس دل  
جي درد جو پاڻي اکين جي ٿانو کان گهٽو ٿي پيو هو. هن چوڪري جي دل  
چاهيو هو ته هو، ڊيل بنجي سندس اکين جي پاڻيءَ کي پي وڃي پر سماجي  
رسمن جي بندڻن جازنجير کڙڪڻ لڳا هئا. شاعر چاهيندي به سندس  
زنڄيرن جي ڪنهن ڪڙيءَ کي کولي نه سگهيو هو.

”هو، سفيد ڪپڙن ۾ اڀرائن جي راڻي“ فليٽن جي پرين، ونگ  
مان وري شفيع فقير جو آواز ٻريو. هن جي اندر مان سڌو ڪنهن آلي  
جيان اڀري نڪتو، جيڪو سندس سرير کي ساڙيندو ويو.

هن الماريءَ جو در کولي اندر پيل سفيد جوڙو ڏٺو، جيڪو هن  
ويه ورهيه اڳڪ پاتو هو. هن شيفون جي نرم ڪپڙي کي هٿ لٽو ۽  
سندس اکيون چوماسي جي مند بڻجي پيون. نه ڪاڪنوڻ ڪڇي، نه ڪا  
گجگرڙ ٿي، پر اندر جو ٿر جل ٿل ٿي ويو. هن ڊنل اکين سان وري لائونج  
۾ لپي پاتو، جتي سندس مڙس يشواز ريگل جو ڍڪ پري ڪو ولايتي  
سگريٽ ڊڪائي رهيو هو. ماضيءَ جو گرڙ پڪي کيس ڳڙڪائي سنڌ  
يونيورسٽيءَ جي ڪاريدورز ۾ وٺي ويو.

”تو جو ڳاڙها جوڙا اٿا، ننگر شهر ۾ نير مهانگو.“

شاعر جا لفظ سندس اندر ۾ وڌ ويهڻ لڳا. هن اکين جي آلاڻ کي وقت جي  
ٽشو پيپر وسيلي جذب ڪرڻ چاهيو، پر درد ايترو گهڻو هو، جو بهڙالي  
جءُ جا وهڪرا بند نه ٿي سگهيا. اندر اٿلي پيو. سيني جي ..... اکين وسيلي  
دل جي جزيري کي ٻوڙي ڇڏيو.

ويه ورهيه اڳ شاعر سنڌي نياڻين جي تعليم جو طعنو ٻڌي  
پنهنجي دل جي قلعي جو ٻاهريون دروازو بند ڪري ڇڏيو ۽ هو، هڪ لک  
پئيءَ جي لاڏلي بنجي ويئي. ”پر مليو ڇا؟“ هن سڌڪن جي پڙاڏن ۾  
سوچيو. ويهن ورهين جي تنهائي... وهسڪي ۽ سگريٽن جي گڏيل پوءِ...  
جسم اچارو... گڙڪندڙ بدن جي تڙپ... رسيلن چپن جي رس بنا ڪشيدگيءَ  
جي... لک پتي مڙس دواهي جيون کان عاري... بدن جي بٺ زمين تي  
مينهن ڪڍي وسي بهت ڪيئن وسي...؟ اڻ مندائن ڪڪرن وانگر هلڪي

ڇانو ڪانپوءِ غائب... نسل کي وڌائڻ جي فطري تمنا ڪٿان پوري ٿئي؟“  
 ”شاعر کي الائي گهڻا ٻار هوندا...؟“ ان سوال سندس من ۾ آسودگي  
 پکيڙي ڇڏي. ”ها ڪنهن ٽي وي چينل تي انٽرويو ڏنو هومانس... دلر ٻارن  
 جو هوس“ کيس ائين لڳو ڄڻ اهي ٻار سندس ٻار هجن. سندس چهري تي  
 مرڪ تري آئي.

هوءَ اڃان به ڪپڙن جي الماريءَ وٽ بيٺي هئي. سندس هٿ اڃان به  
 ٽيفون جي اچي جوڙي تي هئا. گذريل ويهن سالن دوران هن ڪڏهن به اچو  
 جوڙو نه ڀاتو هو. صرف انڪري ته ڪٿي اهو اچو جوڙو پائڻ سبب سندس  
 بدن شاعر جي گواهي نه ڏيئي ويهي هن الماريءَ مان اهو اچو جوڙو  
 ڪڍيو ۽ هو ته پنهنجي پيلي رنگت کي اچي جوڙي تي گهمي رهيا آهن.  
 هوءَ سوشل ٿيڻ لڳي. هن پنهنجي مڙس ڏانهن واجهائڻ نه پئي چاهيو. هو  
 ته شاعر جي ٻانهن ۾ هئي ۽ ويهن سالن کان پوءِ کيس محسوس ٿيڻ لڳو  
 ته هوءَ هڪ مڪمل عورت آهي..... مڪمل عورت .... سندس اکيون بن ٿي  
 ويون ڪنن ۾ شفيق فقير جو آواز هلڪو ٿيڻ لڳو. اڙي شهر جانان کي  
 توکي ..... سنڀارون ..... هوءَ مستيءَ ۾ هئي يا بيهوشيءَ ۾ کيس ڪابه خبر نه  
 هئي پر هوءَ اچي جوڙي ۾ ڪوه ڪاف جي پري لڳي رهي هئي. شاعر  
 ويڄاري کي ڪهڙي خبر ته هوءَ زندهه به آه يانه،



## فقير جو پڙ

ورهاڱي کان ويهارو ورهيه پوءِ جي ڳالهه آهي، جڏهن شاهي بازار واري مشهور پساريءَ ولي محمد جو پسارڪو دڪان وڪر سميت وڪجي ويو. پساري ولي محمد جي دڪان ڳڻڻ جو ڏک هڪ ته سندس پوٽي اقرار ڪي ٿيو، ٻيو وري ٻاليشاهڻ پارو ڪي ٿيو، جيڪا دڪان ڳڻي وڃڻ کانپوءِ به روز صبح جو سوير، جيسيتائين بازار کلي، دڪان جي ٿلهي تي اچي ويهي رهندي هئي ۽ ڪنهن گمان ۾ گر هوندي هئي.

پنهنجي ورهين جي پارو اڃان به ساڳي ڪاٺن ۽ مليل جي ساڙهي پائيندي هئي، جنهن جو بلائوز پنهنجا سمورا رنگ وڃائي چڪو هو. ڪو زمانو هو، جڏهن شاهي بازار ۾ ٻهاري ڏيندي ۽ جهڪندي هئي ته سندس مختصر مللي بلائوز، بلا جون اداون لڳندو هو، جنهن مان نسري آيل پگهر سموري بازار ۾ مشڪ جيان ميهڪي پوندو هو. هوءَ جڏهن صبح جو سوير شاهي بازار ۾ ٻهاري ڏيندي هئي ته ائين لڳندو هو، جڻ سندس جسر پنهنجي منهن ڪو غزل چونڊو هجي، ڪا شاعري ڪندو هجي.

مولوي اميرالدين، پارو ٻاليشاهڻ تي هرڪندو رهندو هو، اميرالدين ورهاڱي دوران هندستان کان هجرت ڪري آيو هو ۽ شاهي بازار ۾ هڪڙي مسجد جو پيش امام بڻيو هو. جيتوڻيڪ هو ڪو مذهبي ماڻهو ڪونه هو، بس ورهاڱي ۾ هندستاني رياست اترپريش کان سفر دوران سندس ٻچي ڏاڙهي وڌي وئي هئي، جنهن جو فائدو وٺندي هڪ ته مسجد جو پيش امام ٿي ويو، ٻيو ڪوڙي دعويٰ ڪري فقير جي پڙ ۾ چڱو خاصو گهر هڻ ڪري ورتائين، جنهن جا پورشن ٺاهي، ڪرائي تي ڏئي ماهوار آمدني ڪمائيندو هو.

مولوي اميرالدين فجر نماز پڙهائي، جڏهن شاهي بازار مان پنهنجي گهر ايندو هو ته رستي تي روزانو کيس پارو ٻهاري ڏيندي ملندي هئي. مولوي اميرالدين ٻهاري ڏيندڙ پارو جي غزل چونڊڙ جسر جا مصرع،

مطلع ۽ مقطع ٿيڌي اک سان پڙهڻ جي ڪوشش ڪندو هو. جنهن ڪري سندس رڌ واري پيڌ جهرڪي پوندي هئي، جهرڪڻ يا جهرڻ واريءَ ان حالت ۾ مولوي اميرالدين جو ڪيٽي وارو سفيد پاجامو ٿورو ٿورو پسي آلو ٿي ويندو هو، جنهنڪري مجبورن ظاهر نماز لاءِ کيس غسل ڪري، پاجامو بدلائي اچڻو پوندو هو.

مولوي اميرالدين کي زال ڪونه هئي، شايد يوپي، ۾ ئي مارائي يا وڃائي آيو هو، بس هڪڙي نوجوان ڌيءَ هئس، جنهن جو نالو 'سليما' هو. سليما گهر ۾ سلائي ڪڙهائي، جو ڪم ڪرڻ سان گڏ ڪجهه ٻارن کي سڀارو پڙهائڻ شروع ڪيو. سليما جا نقش ۽ مٺاندا پڪا هندستاني هئا، جن تي مدراسي پاڻي ڪجهه سرسُ چڙهيل هو، مطلب هو، آفيمي ۽ ڪاري رنگ جهڙي مُشڪڻ هئي. ڊگهو ڊگهو افلاطوني نڪ ۽ اپريل گلن تي ڪارو هسو چڱن پلن کي موهي رکندو هو. وڌيڪ تير نير ڪش جهڙي چلينڊڙ ۽ چينڊڙ نهار ماڻهو، کي صفا ڦٽڪائي رکندي هئي. سليما جا چاهيندڙ گهڻو ڪري فقير جي پڙ واري چاڙهي، تي ڪنڊ پاسا ورتيون، چڪيا چڙهڻ لاءِ سدائين رضامند بيٺا هوندا هئا، جڏهن هو، گهر جو سودو سڙهو يا وري سلائي، لاءِ بٽڻ، سٺي ڏاڳو وٺڻ ڪرندي هئي.

ورهائي جي ويهن ورهين کانپوءِ به سليما ڪناري هئي، هن پرڻو ڪونه ڪيو هو. شايد لکڻي ۾ ئي نه هئس. ورهائي کانپوءِ لڏي آيل اڪثر رهواسين جيئن سرفراز خان ڪلهوڙي کي بابا سرفراز پير بڻائي ڇڏيو هو ۽ مٿس عرس قواليون ڪرڻ لڳا ۽ ميان سرفراز ڪلهوڙي جي درگاه تان دعا ڦيڻو يا ڏاڳو تعويذ وٺندا به هئا، ائين ڪجهه وقت کانپوءِ اوڙي پاڙي جا ڪيئي گهر ۽ خاندان به اهڙا به هئا، جن جون عورتون سليما کان به ڏاڳو ڦيڻو ۽ تعويذ ڪرائڻ لڳا ۽ سليما کي بيبي ستي جتي سمجهڻ لڳيون.

ڏنن ورهائي جي شروعاتي ڏينهن ۾ پيو لوگهن وانگي رُلندو وڌندو هو، کيس سدائين روڊ ٿيل هوندي هئي، اڃان ليڪ جيترا وار ڦٽندا مَس هئس ته ڪنهن نه ڪنهن حجر جي بئنج تي ٽپ ڏئي ويهي رهندو هو ۽ سامهون رکيل پاڪي ڪٿي حجر کي ڏيندو هو ته مٿي تي هلاءُ. حجر سندس روڊ ڪري، اجرت جي بدلي ۾ هڪڙو ٻهڪ ۽ ٽونگو سندس روڊ تي هڻي ڇڏيندا هئا. ڏنن جي روڊ تي سدائين آلي مٽيءَ جو ليپ يا وري صندوق جو ليڪو نڪتل هوندو هو. ڪڏهن جي ڪنهن مندر مان صندوق نه ملندو هوس ته هو ڪنهن اسڪول ۾ گهڙي ويندو هو ۽ ڪلاس ۾ پيل بورڊ تي لکڻ وارو چاڪ ڪٿي ٽڪڻ تي اچو ليڪو پائي ڇڏيندو هو. شاهي

بازار توڙي فقير جي پڙ جا ماڻهو کيس 'چريان' ڪوٺيندا هئا، هو سمجهندا هئا، ڏنن درويش آهي، ڪن ماڻهن جو خيال هو ته ڏنن جي ننڍپڻ ۾ ڪنهن بيماريءَ سبب ڪل ٽريل آهي، سو پنهنجي وس ۾ ڪونهي، بس ايترو وس سو ضرور اٿس ته ڪپڙا نه ٿو لاهي گهمي، باقي ٻيو مڙئي خير آهي.

ڏننءَ کي جيڪو به ماڻهو ڪا شيءِ ڏيندو هو ته هو کائي ويندو هو. ڏنن گهڻو ڪري رات جو فقير جي پڙ ۾ يا وري بازار جي ڪنهن دڪان جي ٿلهي تي سمنهندو هو، جڏهن کان هڪ رول ڪٽي ننڊ ستل ڏنن جو منهن چٽيو هو تڏهن کان ڏنن، ڪڏڙا گلي ۾ وڃي سمهڻ شروع ڪيو هو جتان ڪڏڙن واري مڙهي مان بيٺي ڪڏڙي کيس وٺي وڃي مڙهيءَ ۾ رهائڻ شروع ڪيو هو. مڙهيءَ جا ڪڏڙا کيس الله لوڪ سمجهي ڏاڍو پائيندا هئا ۽ کيس جام ڪارائيندا پيئاريندا هئا. سمهڻ مهل مڙهيءَ جو سردار بيٺو کيس پنهنجي ڪوٺيءَ ۾ وٺي وڃي پاڻ سان گڏ سمهاريندو هو، جنهنڪري سردار ڪڏڙي جي ڪوٺيءَ مان چنگهڻ جا آواز پيا ايندا هئا جن مان هڪڙو عجيب سُور ۽ مزو چغلي ڪائيندي محسوس ٿيندو هو. پر مجال آهي مڙهيءَ جي ٻين ڪڏڙن جي، جو اهو آواز ڪن ڏئي ٻڌن به، جي زوري ڪري اهو آواز سندن ڪنن تي پوندو به هو ته ڄڻ ٻوڙا ٿي ويندا هئا.

مولوي اميرالدين فجر جي نماز کانپوءِ بازار مان گهمندو ڦرندو چڱي صبح چڙهي گهر ايندو هو ۽ وهنجڻ مهل پاڄامو ٻاڻيءَ ۾ پٽائي ڇڏيندو هو. شروع شروع ۾ ته سليما ڪين ڪُچيو، نيٺ هفتي ڏهن ڏينهن کانپوءِ به اها حالت ڏٺائين ته مولوي اميرالدين کان پڇيائين:

”ابا! ڪاهوئا، روز روز پڄامه پگو ديئو، ڪا مشلا هي...!!؟“  
پهرين ته مولوي اميرالدين هڪو وڪو ٿيو، پر پوءِ گيت ڏئي، نڙي آلي ڪندي چيائين:

”لگت هي ٻوڙهو هوگيو، مارو پيشاب بوند بوند ٽپڪ جاوي، ڪا ڪرون بيتيا...“ ان لمحي سليما چنچلتا وڇان ڪلندي چيو:

”ابا! ٿو، تو ڪهت هي مين دوسري شادي ڪرون، اب ڪهت هي ٻوڙهو هوگيو.“ مولوي اميرالدين وڌيڪ ڪُچڻ ۽ چوڻ بدران آهستي آهستي ظهر جي نماز لاءِ نڪري ويو ۽ سليما پاڄامو ڏوئيندي پڻڪندي چوندي رهي:

”ابا! تو جهوت بولت هي، پاڄاما ڪو تو لگت هي ڪه گوند چپڪ گئي هي...“ جڏهن مولوي اميرالدين ظهر نماز پڙهائي موٽندو هو ته منجهند



جي ماني ڏيڻ مهل سليما کيس صلاح ڏيندي هئي ته پيشاب ڇا ٿيڻا ڪرڻ جو علاج ڪرائي، ٻيو ته ٻياري وٺي محمد وٽ هليو وڃي. اهو ئي کيس ڪا پڙي يا ڦڪي ڏيندو ته نيڪ ٿي ويندو، جو ٻياري وٺي محمد وڏو هوشيار آهي، حڪيمن طبيبن کان وڌيڪ ڄاڻو آهي.

ٻياري وٺي محمد جو دين دنيا ۾ هڪڙو ئي پٽ هو، جيڪو ورهاڱي کان اڳ سرڪاري ملازم هو، پر ورهاڱي کانپوءِ به سرڪاري نوڪر رهيو. ٻياري وٺي محمد پٽ کي وڏا وس ڪيا ته چورو دڪان تي ويهي، پنهنجو واپار ڪري. پر پنهنس اسرار به درجا ڇا پڙهيو هو، پاڻ کي انگريز ۽ آفيسر سمجهندو هو. وٺي محمد ٻياري کيس سمجهائيندو هو ته ’نوڪري پرائي نوڪري ۽ غلامي آهي، ٻيو ته زندگي گذارڻ لاءِ رڳو انگريزي ئي ڪم ڪونه ايندي، ڪٿي ديسي ته ڪٿي سنڌي به ٿيڻو پوندو.‘ ٻياري وٺي محمد کي ورهاڱي کانپوءِ جيڪو وڏو ارمان هو، سو اهو هو ته سندس ڪاٻي، توڙي ساڄي ۽ سامهون وارا سمورا دڪان قبضو ٿي ويا، جنهنڪري شاهي بازار جو ديسي رنگ صفا ڦري ويو. انگريزن جي ٽائيم ۾ به شاهي بازار ايڏي اوڀري نه لڳندي هئي، جيسري ورهاڱي کانپوءِ محسوس ٿيڻ لڳي. ان کان به وڌيڪ کيس اهو صدمو هو ته واپار ۽ ڪاروبار مان ايمان ۽ ايمانداري موڪلائي وئي. سمورو ڌنڌو حرفت ۽ چالاڪي، جي نذر ٿي ويو، جنهن ڪري وکر جي خاصيت ۽ اصليت صفا ڌڪجي پئي.

ٻياري وٺي محمد جو هڪ ئي پوٽو هو، جيڪو اسڪول يا ڪاليج کان موٽڻ مهل، منجهند جي ماني ٻڌي وٽس دڪان تي ڪٿي ايندو هو ۽ جيستائين سندس ڏاڏو وٺي محمد ٻياري ماني کائيندو هو، تيستائين سندس پوٽو اقرار وينو گراهڪن توڙي بازار ۾ اچ وڃ جو واءِ سواءِ وٺندو هو. هڪ ڀيري جڏهن اقرار ڏاڏي جي ماني ڪٿي پهتو ته سندس دون ڏسندي ئي ڏاڏنهن چيو هو:

”چوڪرا! لڳي ٿو ته دون سان گڏ تنهنجو مڃالو به ناچاق آهي.“  
جنهن تي اقرار کيس چيو هو ته کيس مٿي ۾ سور آهي. ان ئي لمحي ٻياري وٺي محمد ٻن مختلف برنين مان ڪجهه سڪل پن ڪٽي، پاڻي، جي هڪ گلاس ۾ ميهي، پاڻي کيس پيئڻ لاءِ ڏنو هو. اقرار کي ڪجهه ئي پلن ۾ قرار اچي ويو هو، ان ڏينهن کيس پڪ ٿي وئي هئي ته سندس ڏاڏو ٻياري وٺي محمد مٿا طبيب آهي، هو ساڻس جيڪي به ڳالهيون ڪندو آهي، سي حوالن، پر حقيقت هونديون آهن.



پساري ولي محمد، اقرار ڪي چوندو هو ته: ”آبا! پڙهين ته صفا انگريز لڳو وڌي، تون ئي ڪي گُر مون کان سڪي وڌ، هروڀرو ڪنهن ويڄ طبيب ڏانهن وڃڻو نه پوندو.“ جنهن کانپوءِ پساري ولي محمد پنهنجي ويهڻ واري دخل ڀرسان رکيل هڪڙي ننڍڙي العاريءَ ڏانهن اشارو ڪندي کيس چوندو هو:

”منهنجي مرڻ کانپوءِ هي ڊائريون ۽ بنديون تون سنڀالجان، وڏي ڪم جون اٿئي!“ پساري ولي محمد جو دڪان جڏهن وڪر سميت وڪيو هو ته سندس پوٽي اقرار صرف اُهي ڊائريون ۽ بنديون ئي ڪڍي آئي گهر رکيون هيون، جن کي ڪڏهن ڪڏهن ڇنڊيندي ڦوڪيندي پڙهي وٺندو هو. ولي محمد پساريءَ جي دڪان تي شهر ۽ پسگردائيءَ وارن ڳوٺن جا به ڪافي گراهڪ ايندا هئا، جن ۾ مرد توڙي عورتون شامل هونديون هيون. هڪڙي پيري اقرار جڏهن منجهند جي ماني ڪڍي وٺس ويو ته ان وقت سندس ڏاڏو ولي محمد هڪ ڪراڙي زائفان جي سودي جو حساب ڪري رهيو هو، اها زائفان جيڪا شايد سندس پراڻي گراهڪ هئي، سا کيس ٻڌائي رهي هئي ته هفتو کن اڳ ڪرڙ کي ڳوٺ وارن ڪارو ڪري ماري ڇڏيو. ان وقت پساري ولي محمد کان ڏانهن نڪري وئي هئي ۽ ڪراڙي زائفان کي چيو هئائين:

”مائي! خير گهر، اهو ڇا پئي چوين؟ ڪرڙ جي هاڻي اها ڪا وهي هئي، جو پراڻو لوڙهو لتاڙي، يا ڪارو ٿئي!!“ پوڙهيءَ زائفان ان لمحي اکين تي آڱريون رکندي قسر ڪندي چيو هو:

”الله جو سئون، ڪرڙ رڳو لوڙهو ئي نه لتاڙيو هو، پر صفا ليڪو به لتاڙي ويو هو، پنهنجي نياڻين جيڏي نينگر سان گريل هو.“ ان لمحي پساري ولي محمد کي ڪجهه ئي ڏينهن اڳ جي ڳالهه ياد پئي هئي، جڏهن پوڙهو ڪرڙ خان وٽس ڦڪي وٺڻ آيو هو، پساري ولي محمد کيس ڦڪي ته ڏني هئي، پر چيو هئائينس ته:

”ڪرڙ هيءَ آخري ڦڪي اٿئي، بس وڌيڪ جيڪڏهن هاڻي ڦڪي ورتو ته پوءِ گوڏا صفا ڇٽ ٿي ويندو. سو ٻيلي هاڻي ويهي الله الله ڪري ڇڏ ويڇاري مڙهي مائيءَ جي به پڇر.“ جنهن تي ڪرڙ هڪڙو وڏو تهڪ ڏيندي چيو هو:

”ميان سيٺ ولي محمد! مائي هجي ها ته ڪو ويهي هن عمر ۾ ڦڪيون وٺان ها ڇا توکان، اها مرحيات ته ڪي ورهيه ٿيا، جو وڃي قبر پيڙي ٿي، هي ته مڙئي شوق شغل ڪڏهن ڪڏهن ڪندو آهيان، ڇا ڪريان!

مرد آهيان نه، سو پنهنجي، عادت کان ڪٿي ٿو مڙان...!!“ جنهن تي پساري وٺي محمد وڏو ٽهڪ ڏيندي چيو هو،

”هائو هائو ڪرڙ! آهين صفا سچو، مرد مرڻ ڪندي، هوندو، تڏهن به پنهنجي، عادت کان نه ويندو، پوءِ پل ته مٿ ڪندي ٻڃي پُسي ويندي هجيس...!!“ ڪرڙ وڏو ٽهڪ ڏيندي، هڪڙو ٿڌو ساهه ڪندي چيو هو:

”هه هه سيٺ! آهي به ڪي زمانا هئا، جڏهن مُتبو هو ته ڊپ پيو ٿيندو هو ته ڪٿي ڌار ڌوڻ به نه لڳي ۽ هاڻي مُتون ٿا ته ڊپ پيو ٿيندو آهي ته ڪٿي ٻڃي نه پُسي وڃي، اهي ته سيٺ تو واريون ڦڪيون آهن، جو ڦوڪيا ۽ ڦنڊيا وُتون، نه ته باقي مڙوئي خير اٿي...!!“ عورت وکر وٺي جڏهن رواني ٿي ته اقرار ڏاڏي کان پڇيو:

”ڏاڏا سائين! اهي لوڙها لتاڙڻ ڇا هوندا آهن...؟“

”ابا! لوڙها لتاڙڻ بي حياتي ۽ بچڙائي آهي ٻيو ڇا؟! ائين سمجه ته هڪ بيماري آهي، جيڪا ماڻهن جي خصلتن کي ڪاٺي خلاص ڪندي آهي...!!“

”ڏاڏا! اها بيماري ڇو ٿيندي آهي؟“

”چوڪرا! بيماري ڪهڙي به هجي، يا ته بک کان ٿيندي آهي، يا وري ڪمزوري، کان ٿيندي آهي، جيئن بک جو ٽول سڙڻ کي ديوانو ۽ پاگل ڪندو آهي، ائين ئي ڪمزوري، جو هول نسل ڦيڙي رکندو آهي.“ ڏاڏي جي گذاري وڃڻ کانپوءِ اقرار پنهنجي ڏاڏي جي لکيل هڪڙي بندي، به پڙهيو هو ته:

”نسلي ماڻهو بک به ديوانو ناهي ٿيندو، نه وري ڪمزور ٿيندو آهي، بچڙائي ته اُن ماڻهو، جو پاسو وٺندي آهي، جنهن جي نسل به ڦير هجي، يا وري اوڀري صحبت جو وا، لڳو هجيس...!!“ اقرار کي ڏاڏي جون اهي ڳالهيون اُن وقت سمجهه به نه آيون هيون.

پارو هاليشاڙ روزانو سلاوتين جي پاڙي جي پڪ به، خوجن جي جماعت خاني پٺيان واري مندر ويندي هئي، پارو پڳوان کي پرنام ڪري، اُتان تِلڪ پنهنجي، پيشانيءَ تي لڳائي، جڏهن واپس مندر کان نڪرندي هئي ته واپسيءَ واري لنگهه تي پنڊت ڪرتولال پرشاد ورهائڻ لاءِ بيٺل هوندو هو. پنڊت ڪرتولال کان هوءَ جڏهن جُهڪي پرنام ڪندي پرشاد وٺندي هئي ته ڪرتوءَ جون نظرون ترڪي سندس بلائوز تي پونديون هيون، کيس محسوس ٿيندو هو ته ڪرتوءَ جون نگاهون سدائين سندس بلائوز کان اندر تائين لهي وينديون آهن، جنهن ڪري هوءَ مندر به هوندي

به پنهنجو پاڻ کي غير محفوظ ۽ اڳهاڙو پائيندي هئي. اُهو ساڳيو غريانيءَ جو احساس کيس تڏهن به ٿيندو هو، جڏهن مولوي اميرالدين کيس تڪيندو بازار مان لنگهندو هو. هوءَ سوچيندي هئي ته ڀڳوان جي گهر ۾ ويٺل ڪرتوءَ جي اکين ۾ راوڻ ۽ الله جي گهر مان نماز پڙهي نڪرندڙ مولوي امير جي اکين ۾ شيطان ئي ڇو نظر ايندو آهي.

پارو مندر ۾ پراڻا ڪري پساري وٺي محمد وٽ دوا لاءِ ايندي هئي، ان لاءِ جو پارو جو مڙس واسديو شروع کان ماڪيءَ جي ماناري وانگي ڄميل رهيو هو، نه ميڻ ٿي ڪا جوت جلائي هُيائين، نه وري ڪو ريج ٿي رڄيو هو. پارو ويچارِي، واسديو جي ماناري کي رڄائڻ يا وري منجهس ڪا جوت جلائڻ لاءِ ڪڏهن مندر ته ڪڏهن وري وٺي محمد پساريءَ وٽ ايندي هئي. پارو باليشاهڻ وٺي محمد پساريءَ وٽ هونئن ته روز ايندي هئي، ساڻس سلام دعا ڪندي هئي، ڪڏهن ڪڏهن به پل ويهي ڪچهري به ڪري وٺندي هئي، پر مجال آهي جو وٺي محمد پساريءَ کيس بد نگاهه سان ڏٺو به هجي. ها! پر پارو جي اچڻ شرط سندس اکين ۾ ٻنهي وٺي محمد کي پتو پئجي ويندو هو ته هوءَ سلام دعا يا ڪچهريءَ لاءِ آئي آهي يا وري واسديو جي ڦڪيءَ لاءِ! جڏهن ٻنهي مان هو سمجهي ويندو هو ته پارو ڦڪيءَ لاءِ آئي آهي ته وٺي محمد دڪان جي پٺئين پاسي واري گدام واري ڪوٺيءَ ۾ هليو ويندو هو ۽ هڪ ڦڪي ٺاهي آئي پارو کي ڏيندو هو. پارو ڦڪي وٺندي، هلڪي آواز ۾ چوندي هئي:

”پڙي ته واسديو کي ڪارائيندي اڃان، پر واسديو اهو ئي ساڳيو پڙي آهي، پل جي جوت ٿئي ٿي، پر وري اتي جو اتي وساميو وڃي.“ پارو ته ڳالهه ڪري هلي ويندي هئي، پر وٺي محمد پساري هلڪو مُرڪي پُڪندي چونڊو هو:

”تون به چري آهين پارو، جيڪو ڄاڻي ڄم کان پڙي هجي، سو ڪيڏا به حيل ڇو نه ڪجن، ڦڙي وري ڪٿان ٿيندو! پارو تون مائي پلي آهين سو توکي نااميد نه ٿو ڪريان؛ نه وري تنهنجي دل ٿو ٽوڙيان، باقي تو وارو واسديو ڪڏهن به جوت نه جلائيندو.“

ڏنن روزانو رُلندي پَندي اڪثر صبح جو مولوي اميرالدين جي گهر ايندو هو، جيستائين مولوي سج چڙهي بازار مان گهمندو ڦرندو گهر پهچي تيستائين سليما ڏننءَ کي چانهه سان ڦلڪو ڪارائي روانو ڪري ڇڏيندي هئي. ڏنن جيڪو ٻاراڻي وهيءَ مان چوڪرات اچي ٿيو هو سو کيس ڪا به جهل پل نه هئي. هو اڪثر گهرن ۾ ماني چانهه لاءِ گهڙي ايندو



هو، عورتون کيس درويش سمجھي ماني يا ڪا شئي ڪاڻڻ لاءِ ڏينديون هيون ۽ سمجھنديون هيون ته ڏنن، جي اچڻ سان سندن پاڳ وريو آهي، جو ڏنن الله لوڪ آهي.

ان زماني ۾ پارو اوچتو ڪجهه وقت لاءِ گم ٿي وئي ۽ پساري ولي محمد وٽ اچڻ ويڻ ڇڏي ڏنائين، ڪو سال سوا کانپوءِ ظاهر ٿي ته سندس جهوليءَ ۾ هڪڙو ننڍڙو ٻار هو. پساري ولي محمد کيس ڏٺو ۽ تعجب وڃان چيائين:

”ڪٿي گم هئين، پارو، ڦڪي پڙي، لاءِ به نه آئين،...؟“  
”ها سيٺ، بس! ڦڪي پڙي، جي ضرورت ئي نه پئي، تنهنڪري...!“  
”ڇو، پڙي، جي ضرورت ئي نه پئي، آسرو پلي ڇڏي ڇا واسديو مان...!“ هو، ٿورو اداس ٿي وئي،  
”ها سيٺ، واسديو ئي نه رهيو ته آسرو پلڻو پير نه...!“ ولي محمد کان چڻ چرڪ نڪري ويو.

”اهو ڇا پئي چوين پارو...!“  
”سيٺ! سچ پئي چوان، واسديو کي مٿان اچي سال ٿيو آهي، پرلوڪ پڌاري ويو...!“ ٿوري دير سوچڻ کانپوءِ پساري ولي محمد وري کيس چيو:  
”هي ٻار ڪنهن جو آهي؟“ پارو ٿورو مُرڪندي ٻار کي ٺهاريو ۽ چيائين:

”منهنجو ٻچڙو آهي، پيو وري ڪنهن جو هوندو...!“  
”تنهنجو، مطلب تنهنجو...!“  
”هائو هائو سيٺ! منهنجو پيٽ ڄاڻو، پيو ڇا؟“  
”ڇٽو ته واسديو کانپوءِ پيو پرڻو ڪيو اٿئي...!“  
”هه هه سيٺ! اهو ڇا پيو چوين! اسان وٽ ڪو ٻي پرڻي جو رواج آهي ڇا؟“

”پوءِ تنهنجو پيٽ ڄاڻو ٻار وري ڪٿان ٿيو؟“  
”واسديو مان ٿيو، پيو وري ڪٿان ٿيندو؟“ پساري ولي محمد ڪن ساھي، لاءِ خاموش ٿي ويو، پارو جي مُنهن ۾ چٽائي ڏنائين، شايد گهڻو ڪجهه پڙهي ورتائين، پر پارو جو پير رکڻ لاءِ چيائين:  
”ڇٽو ته واسديو ويندي ويندي جوت جلائي ويو...!“ پارو هڪي وڪي ٿيندي چيو:

”هائو سيٺ! جوت به جهڙي تهڙي، بس! ڳالهه ئي نه پڇ، تو وارين



پڙين صفا پوريون ڪري ڇڏيون.“ پارو مرڪندي، دڪان تان هيٺ لهندي چيو:

”ڇڱو سيٺ، هلاڻ ٿي...“

پارو دڪان تان لهي هلي وئي، پساري ولي محمد مرڪندي، پڻڪندي پنهنجو پاڻ سان ڳالهائيندي چيو:

”پارو! ڪنهن سان پئي ڪوڙ ڳالهائين، مون ته ڪو وقت ٿيو، جو توکي اُهي پڙيون ڏيڻ ٿي ڇڏي ڏنيون هيون. جنهن ڏيئي ۾ وٽ ٿي نه هجي، اُن ۾ تيل وجهڻ جو ڇا فائدو، مڙئي تنهنجي دل رکڻ لاءِ ڪوڙيون سوڙيون پيو پڙيون ڏيندو هوس، تڏهن ته توکان پئس به ڪونه وٺندو هوس...!“ پساري ولي محمد هڪ ٿڌو ساهه کنيو ۽ وري دل ٿي دل ۾ چيائين:

”پارو، ڪوڙيون پڙيون ڏئي نه مون ڪو پاپ ڪيو، نه وري ڪنهن ٻئي جو پار ڇڻڻ، توتي ڪو پاپ آهي، تنهنجي جهوليءَ ڇنڊ جهليو، ڪم ڀلو ٿيو.“

پساري ولي محمد جو دڪان وڪجي ويڃڻ کانپوءِ اقرار جڏهن به شاهي بازار مان صبح جو سوير ڪير وٺڻ لاءِ گذرندو هو ته پوڙهي پارو دڪان جي ٿلهي تي آڏاس ۽ وياڪل ويٺل هوندي هئي. اقرار ننڍي هوندي جڏهن ڏاڏي لاءِ منجهند جي ماني دڪان تي ڪڍي ايندو هو ته ڪيترا ڀيرا پارو کي پنهنجي ڏاڏي مرحوم سان ڳلندي، ڳالهائيندي، ڪچهريون ڪندي ڏٺو هئائين، ڪيترا ڀيرا ڏاڏي مرحوم کي پڙي ڏيندي به ڏٺو هئائين، جيڪا پارو وٺي، ساڙهيءَ جي وَر ۾ ويڙهي رواني ٿي ويندي هئي. هڪ ڀيري اقرار پنهنجي ڏاڏي کان پڇيو به هو ته:

”ڏاڏا! هن مائيءَ کي ڪهڙي پڙي ڏيندا آهيو ۽ پئسا به نه وٺندا آهيو...؟“ جنهن تي پساري ولي محمد هڪڙو ٻهڪ ڏيندي کيس چيو هو ته:

”آبا! اها پڙي لڪ جي آهي، مائي کي ان ڪري ڏيندو آهيان ته متان سندس ڪُڪ سائي ٿي پوي...!“ جنهن تي وري اقرار معصوم انداز ۾ ڏاڏي مرحوم کان پڇيو هو:

”ڏاڏا! اها ڪُڪ سائي ٿيڻ ڇا آهي؟“ ٿورو ڳلندي پساري ولي

محمد چيو هو:

”ڪُڪ سائي ٿيڻ، مطلب مائيءَ مان ماءُ ٿيڻ آهي.“ اقرار وري

معصوميت وڃان چيو هو:

”ڏاڏا! ماءُ ٿيڻ لاءِ پُڙي ضروري هوندي آهي ڇا؟“ اُن لمحي پساري  
 ولي محمد ٽهڪن ۾ ٻڏي ويو هو. سامت ۾ آيو ته چيو هئائين:  
 ”پُڙي يا وري ڦڙي ضروري آهي ماءُ ٿيڻ لاءِ!“ پساري ولي محمد  
 وري ٽهڪن ۾ ٻڏي ويو هو، اقرار ڏاڏي کي حيرت وڃان ڏسندو رهيو هو،  
 ”ڏاڏا! اها ڦڙي وري ڇا آهي؟“  
 ”ڇوڪرا! ڦڙي وڏو ڪرشمو آهي، ڦڙي مان تلاءُ ٿيندو آهي، شڪر  
 ۾ ٻيو ساهه پوندو آهي..“ اُن کان اڳ جو اقرار ڪو ٻيو سوال ڪري،  
 پساري ولي محمد کيس ٿانو ڏيندي چيو هو:  
 ”تون هاڻي هل گهر، دير ٿي وئي اٿئي!“ اقرار خاموشيءَ سان ٿانو  
 کڻي پساري ولي محمد کي حواليه نگاهن سان ڏسندو هليو ويو هو.  
 اقرار پساري ولي محمد جي گذاري وڃڻ کانپوءِ سندس دُڪان  
 واري الماري مان کڻي آيل بنديون ۽ ڊائريون ڪڏهن ڪڏهن فرصت ۾  
 پڙهندو هو. پساري ولي محمد جي بندين ۽ ڊائرين ۾ ڪنهن جڙي ٻوٽي،  
 ڪنهن وکر جي ڄاڻ سان گڏ يادگيريون به لکيل هونديون هيون. ڊائري جي  
 هڪ ورق تي هن پڙهيو هو ته، ’وکر سو وها، جو پئي پراڻو نه ٿئي‘،  
 جنهن کان پوءِ پارو جو بيان ۽ واقعو پنهنجي محسوسات سان لکيو ويو  
 هو. پساري ولي محمد لکيو هو ته پسارڪي ڪر ۽ گراهڪن سان  
 واسطيداري ۾ هن نه صرف وکر پر ماڻهو، جي سڃاڻپ به سمجهي آهي،  
 ماڻهو به هڪ وکر آهي جيڪڏهن اُن ۾ ڪو هڪ اکر آهي بس ته پوءِ اهو  
 اکر ئي ڪافي آهي. سو مونکي نه ٿو لڳي ته ڪو پارو ڪڏهن ڪسي يا  
 ڪوئي ٿي سگهي ٿي. مون جڏهن پارو جي جهوليءَ ۾ ٻار ڏٺو هو ته مونکي  
 حيرت ٿي هئي. مونکي خبر هئي ته واسديو ۾ ڪو افعال ڪونه هو، اها  
 سڌ مونکان وڌيڪ پارو کي به هئي. پارو جي جسر تي جيتوڻيڪ راڄ  
 ديوانا هئا پر مجال آهي جو ڪا ديوانگي پارو جي هڙ کي چُهي به سگهي،  
 جنهن کي هن الائي ته ڪيئن ورائي وجود سان ٻڌو هو. اها ئي ته هڙ هئي  
 جنهن جو پارو ڌرو به ضايع نه ڪيو هو. جيڪا پارو سموري ڄمار اُپهندي  
 رهي سا ائين ڪيئن ڪناري تي اچي سڙه ڪوليندي؟ جنهن وچ سير،  
 جواني ۾ به ڪنهن طوفان جي پرواهه نه ڪئي. سا واسديو جي مرڻ کان  
 پوءِ ڀلا ڪيئن ٿي ڪنهن طوفان ۾ لڙهي ويندي ۽ پنهنجي سرير تي ڪو  
 ٽڪو لڳائيندي. مون زندگي ۾ وکر سان گڏ ڪي اکر به سمجهيا آهن  
 جيڪي پڻ تي ليکي جيان آهن. مون اُن ڏينهن پارو جي اکين ۾ ڏٺو هو ۽  
 جيڪو ڪجهه پڙهيو هئس اهو ئي سندس گواهي لاءِ ڪافي هو پر پوءِ به

عورت جي اک تي اعتبار نه ڪرڻ واري ڳالهه کي ذهن ۾ رکندي مون سندس ڇاتين ۾ ٻهاريو هو، جيڪي ڪنهن به ريت مامتا جي پراءِ سان مڙيل ڪين هيون. عورت جي وڪ کان ويندي نظر توڙي جسم جي جڙاوت جا جيڪي ڳر سڳيو ۽ سمجهيو آهيان سي مونکي ڪڏهن به دوکو ڏئي نه پئي سگهيا تنهنڪري منهنجي دل قطع به تسليم ڪرڻ لاءِ تيار نه هئي ته ڪو ٻارو پيٽ ۾ ڪو غير تخم ٻاليو به هوندو. جيتوڻيڪ جڏهن ٻارو پنهنجي جهوليءَ ۾ جهليل ٻار سان دڪان تان لهي وئي هئي ۽ مون الائي ڪيئن سندس ڪيل يا نه ڪيل ڏوهه کي پڻڪندي جانب قرار ڏنو هو. پر نه نڪو ائين ٿي ٿي نه ٿو سگهي جنهن عورت جو پگهر مُشڪ ۽ عنبير ٿي مهڪندو هجي تنهن جي ڪڪ ۾ ڪو گند ڪُڪيو هجي، ڪو حرام ٻليو هجي دل مڃي ٿي نه ٿي. بڪ بچڙو ٽول پلي دانائن لاءِ هجي پر اصل لاءِ ڪڏهن به ٿي نه ٿي سگهي. ٻارو منهنجي دڪان تان ٻار کڻي لٽي ته وري ڪڏهن منهنجي دڪان تي نه لڙي جو کيس اندازو ٿي ويو هو ته کائڻس ساڳيو سوال وري پيهر ٿي سگهي ٿو. هوءُ جيڪڏهن ڪنهن رستي راهه ڪڏهن ملي ها ته ساڻس اهو سوال ته وري ضرور ڪريان ها ته،

”ٻارو اهو ٻار ڪٿان آندو اٿئي؟“ مونکي پڪ آهي، منهنجي دل گواهي ڏي ٿي ته ٻيو ڀيرو منهنجي سوال تي ٻارو ڪڏهن به مونسان ڪوڙ نه ڳالهائي ها. هن منهنجي ڪوڙين سوڙين پُڙين جو پل ڪيڏو به ڀرم رکيو يا رکڻ چاهيو هجي پر واسديو جي پُڙي ضرببان پُڙي جو ڪڏهن به ڀرم رکي نه سگهي ها، جنهن جي ڪريا ڪرم واري باهه به ڪنهن گليش واري ۾ رنگ ۽ بي ترنگ هئي.

پساري ولي محمد جي دائري مان ٻارو بابت لکيل احوال پڙهڻ کانپوءِ اقرار ڪڏهن ڪڏهن پساري ولي محمد جي وڪجي ويل دڪان جي ٿلهي تي اداس ۽ وياڪل وينل ٻارو سان ڪچهري ڪندو هو. پهريون ڀيرو جڏهن هو ٻارو سان دڪان جي ٿلهي تي ويٺو هو ته ٻارو کيس نه سُڃاتو هو اقرار ڪڏهن ٻارو کي ٻڌايو هو ته هو پساري ولي محمد جون پوتو آهي ۽ ننڍي لاکي کان کيس پساري ولي محمد جي دڪان تي ايندي ويندي ڏسندو رهيو آهي ته ٻارو ساڻس جلدي رلي ملي وئي. کيس شاهي بازار کان ويندي فقير جي پڙ ۽ ڪڏڙا گلي جون ڳالهيون قصا ڪهاڻيون ٻڌائيندي رهي. ٻارو ماڻهن جي نظرن کان ويندي وڏن رازن جون ڳالهيون اقرار سان ڪرڻ لڳي. ٻارو اقرار ڪي وڏن وچڙيل پپوت وارن واري ان ملنگ جي ڳالهه به ٻڌائي جيڪو صرف هڪ لنگوٽيءَ ۾ شاهي بازار کان فقير جي پڙ ۾



زلندو وتندو هو. جنهن لاء چيو ويندو هو ته جيئن ڌرم وارا کيس ڇڏي ويا آهن. هو، ڪنن جي پاڙين کي پٽيندي توبهون ڪندي چوندي هئي ته،

”پساري ولي محمد جا پوٽا ورهاڱي ۾ جيڪي پاپ ٿيا سي ته پنهنجي جاء تي پر هي فقير جو پڙ پاپن جو پڙ اٿي جنهن ۾ نه ڄاڻ ته ڪيترا پاپ ڍڪيا پيا آهن. اهو جيئن ڌرم وارو لڳندڙ نانگو لانگو ٿيو هڪ شريف مسلمان گهر جو ٻار اٿي، الائي ته ڪيئن گند واري هودي ۾ اڇلائڻ کان پوء به بچي ويو. نه ته اهڙا ڪيئي مُل پتڪڙا وجود ۽ مائين جون اڇلايل اورون پنهنجي هنن هٿن سان لڪ ڇپ ۾ وڃي دفن ڪيون اٿن. مان جڏهن صبح جو سوير پنهنجو جهازو ٻهارو ڪشي ٺڪرندي هيس ته الائي ته ڪيڏو گند ميڙڻو پوندو هٿن ۾ بازار جو، بس دل جون دل ۾ آهن. ٻڌ چوڪرا! تنهنجو ڏاڏو پساري ولي محمد وڏي وکر ۽ وڙ وارو ماڻهو. اهڙا ماڻهو ڪٿي ٻين جن جي اکين ۾ مون ڪڏهن به ڪو مير نه ڏٺو.“ ٻارو هڪڙو ٿڌو ساھ ڪنيو ۽ وري بند پيل دڪان جي تاڪن کي ڏنائين،

”ظاهر ۾ ته هو هڪ سيٺ ۽ واپاري شخص هو پر وڏي وڙ ۽ مٿيا وارو هو، ائين سمجهه ته هنن تختن جيان هو جيڪي حفاظت ۽ پردو آهن ۽ بند آهن ته پڙڪ به ٻاهر نه ٺڪري. اڄڪلهه توڙي ان زماني به ڪٿي هئا، اهڙا پساري جيڪي پڙي سان پساھ وجهن ۽ هر ڪنهن لاء پناهه هجن.“

اقرار هڪ ڏينهن پوڙهي ٻارو کان نيٺ پڇي ورتو ته هو، روز صبح جو ڇا لاء اچي دڪان جي ٿلهي تي ويهندي آهي ۽ ويٺي تاڪن کي ڏسندي آهي. اُن لمحي ٻارو ڄڻ ٻاري جيان ڪن پل لاء ڄمي وئي هئي. اقرار کي هڪ لمحي لاء لڳو هو ته ٻارو ٻرلوڪ ٻڌاري وئي پر هن هڪڙو ٿڌو ساھ ڪشي اقرار ڏانهن ٻهاريو هو ۽ چيو هيائين،

”بس هڪ ارمان رهجي ويو...“ اقرار کيس حيرت وچان ڏٺو هو

”ڪهڙو ارمان...؟“

”بس جيڪر پساري ولي محمد جهڙي ماڻهو سان ڪوڙ نه ڪريان ها.“

”ڪهڙو ڪوڙ...هان.“ اقرار اتاويلو ٿيندي چيو

”مونکي خبر آهي ته پساري ولي محمد منهنجي ڪوڙ کي سمجهي ۽ سهي ڪري ويو هو پر پوء به منهنجو ڀرم رکيو هيائين.“

”ڀرم! ڪهڙو ڀرم؟“ اقرار سواليه نگاهن سان ٻارو طرف ٻهاريو

”اهو ئي ڀرم ته مونکي ڪو واسديو مان ٻار ٿيو، مان سمجهان ٿي ته پساري ولي محمد جهڙي هوشيار ۽ ڄاڻو ماڻهو کي پڪ هئي ته اهو ٻار



واسديو مان ٿي ئي نه ٿو سگهي، مون ڪٿي نه ڪٿي ڪو ڪارو منهن ڪيو آهي. پر وري به هن منهنجي ڪوڙ جو اعتبار ڪيو ۽ منهنجي ڪوڙ جو ڀرم رکيائين” پارو وري هڪڙو ٿڌو ساهه کنيو ۽ وري ڳالهايو، ”بس جيڪر، پساري ولي محمد سان سچ ڪريان ها ته مون ڪهڙو اچو منهن ڪيو، ٻار ته سچ به واسديو مان ڪونه هو.“

”پوءِ ڪنهن مان هو ٻار؟“ پارو ڪنڌ هيٺ ڪري خاموش ٿي وئي، ڪن پل کان پوءِ اقرار ڏانهن ٺهاري ڇيائين

”اهو ٻار ڏنڻ جو هو.“ اقرار کان چڻ چرڪ ٺڪري ويو، ان لاءِ جو هو جڏهن ننڍڙو هو ۽ پرائمري ۾ پڙهندو هو ته، هن ڏنڻ کي شاهي بازار ۾ ڏٺو هو. ڏنڻ جڏهن شاهي بازار ڇڏي ڪنهن اوڙي پاڙي ۾ ايندو هو ته پاڙي جا ڪينچلا ٻار کيس ڇيڙائيندا هئا ته ڏنڻ رعمل ۾ کين گاريون يا بجا ڏيڻ بدران پنهنجي سلوار جي اڳڻ واري جاءِ پنهنجي هٿ سان پڪڙيندي کين ڏيکاريندي چوندو هو،

”هي اٿو...“ اقرار ڏنڻ کي ڪيترا ڀيرا پساري ولي محمد جي دڪان تي به ايندي ڏٺو هو، هو جڏهن دڪان تي چڙهندو هو ته، پساري ولي محمد کيس نبات يا چوهاڙو ڪڍي ڏيندو هو، ڏنڻ اهو وٺي کائيندو هليو ويندو هو. ان وقت جيڪڏهن دڪان تي وينل ڪو گراهڪ پساري ولي محمد کان سوال جو جواب پاڻ ئي ڏيندي چوندو هو ته، ”لڳي ٿو ڪو مست يا درويش آهي؟“ پساري ولي محمد هڪڙو ٽهڪ ڏيندي چوندو هو ته،

”نه نه، مستي ۽ درويشي وڏي رمز آهي، هي ته ويچارو ڪل ٽريل بي عقل چريو آهي.“ اقرار ياد مان واپس آيو ته پارو ڏانهن طنزيه ڏسندي ڇيائين،

”پارو، تو ڏنڻ چرئي سان.....؟“ اقرار جملو مڪمل ڪرڻ کان سواءِ پنهنجي سموري مفهوم سان اڇلائي ڇڏيو. ان لمحي پارو ٽهڪن ۾ ٻڏي وئي. اقرار جيترا ڀيرا به پارو سان ڪچهري ڪئي هئي هن ائين ڪڏهن به ٽهڪ ڏئي نٿو ڪيو نه هو. پارو جڏهن سامت ۾ آئي ته اقرار ڏانهن ڏسندي ڇيائين،

”ڏنڻ چريو ڪريو، ڪوپڙي ۾ هو، پر گودڙي ۾ وڏيون چالاڪيون کنيو وتندو هو.“

”چئبو ته پارو تون ڏنڻ جي چالاڪين جي ور چڙهي وئين؟“ پارو وري ٽهڪن ۾ ٻڏي وئي.

”چالاڪيون ته الائي ڪنهن جون هيون، پر مون نادان پنهنجي سر ڪنيون. هاڻي ڇڏ بس ان قصي کي.“ اقرار هُجَت واري انداز ۾ پارو کي چيو،

”نه نه، ٻڌاءِ پارو، قسمر اٿئي پڳوان جو.“ هُن وري ٽهڪ ڏنو ۽ چيائين،

”پڳوان جي قسمر يا نالي تي به پلا ڪو سچ ڳالهائيندو آهي ڇا؟ پر توسان مان پڳوان جي نالي تي توسان ڪوبه ڪوڙ نه ڪنديس. بس هڪ ٻار دل تي آهي، لاهڻ گهران ٿي، تو پُچيو آهي ته ٻڌايان ٿي. پر وعدو ڪر ته جڏهن به پساري وٺي محمد جي قبر تي ويندين ته منهنجي ڳالهه ساڻس ڪندين، کيس ٻُڌائجان ته مون ساڻس ڪوڙ ڪيو هو، اهو ٻار مولوي اميرالدين جي ڌيءَ، سليما جو هو.“ اقرار وري چرڪي ويو،

”پارو تون ڪوڙ ڇو پئي ڳالهائين، اڳي تو چيو ته ٻار ڏٺون جو هو، هاڻي وري چوين پئي ته ٻار سليما جو هو. سليما ته سَتِي جتي آهي. وڏي ٻُهل عورت آهي.“

”ها تون سچ پيو چوين پيار يولي محمد جا پوٽا، پر اهو به سچ آهي ته اهو ٻار سليما جو ٿي هو، جيڪو ڏٺون مان ٿيو هوس.“ اقرار حيرت ۾ پئجي ويو،

”تون اهو ڇا پئي چوين پارو...“

”اهو ئي سچ آهي جيڪو مان چوان پئي.“ اقرار هيڏانهن هوڏانهن

نهاريندي چيو

”پارو، اُن ٻار جو نالو ڇا رکيو هيءُ؟ هاڻي ته وڏو ٿي ويو هوندو.“

”ها جهڙوڪر جوان ٿي آهي، نالو اٿس سليمر...“

”هانءُ، نالو سليمر اهو ته مسلمانڪو نالو آهي؟“

”ها ٻار به ته مسلمان جو هو سو نالو به مسلمانڪو اٿس، مان پلا،

هڪ مسمان ٻار جو نالو ڪيئن هندن وارو رکان ها.“

”سليمر هاڻي ڪٿي آهي، ڇا ڪندو آهي؟“

”سليمر پڙهندو آهي، سيٺ واجيع الدين جي گهر ۾ رهندو آهي.“

”سيٺ واجيع الدين جي گهر ۾ ڇو؟“ پارو هڪ ڦٽو ساھ ڪيو ۽

چيائين،

”سيٺ واجيع الدين کي اولاد نه ٿيندو هو، سندس زال مونکي ڏاڍو

پائيندي هئي ۽ اولاد لاءِ ڏاڍو سڪايل هئي سو مون ڪٿي اهو ٻار کيس

ڏئي ڇڏيو، ان قسمر ۽ ويساھ سان ته ٻار مسمانن جو ٿي آهي“ پارو جي

اکين م لڙڪ اچي ويا. هن پئل اکين سان قرار ڏانهن ڏٺو ۽ چيائين،  
 "تون جڏهن به پساري وٺي محمد جي قبر تي وڃين ته کيس  
 سوري حقيقت ٻڌائجان." اقرار يڪدم اٿي بيٺو ۽ چيائين،  
 "پارو تنهنجي ڳالهه ٻڌڻ کانپوءِ مون کي هڪ سلام ڏاڏا وٺي  
 محمد جي قبر تي وڃي ڪرڻو هو ته هو ڪيڏو نه وڪر ۽ اکر وارو شخص  
 هو. هن جيڪو چيو ۽ لکيو هو سو سورنهن آنا سچ آهي پر پارو گهٽ تون  
 به ناهين. سچ ته هي سمورو علائقو جيڪو فقير جو پڙ سڏجي ٿو سو ته  
 نالي ۾ فقير جو پڙ آهي. حقيقت ۾ ته فقير جو پڙ تون آهين جنهن جي  
 سرير ۽ آتعام سندن سڃاڻپ آهي فقير پنندڙ نه پر ڏيندڙ ۽ ڏکيندڙ هوندو  
 آهي. فقير ته اهڙو وڪر وهائيندو آهي جيڪو ٻئي پراڻو نه ٿيندو آهي." مان  
 وڃان ٿو سڌو ڏاڏا پساري وٺي محمد جي قبر تي سلام ڪرڻ ۽ کيس  
 تنهنجو احوال ٻڌائڻ پر ان کان اڳ توکي سلام ڪريان ٿو." اقرار سڌو ئي  
 پارو کي سيلوٽ ڪيو ۽ جهٻڪي سندس چرن ڇهياڻين ته سندس اکيون  
 به آليون ٿي پيون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ  
سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنف کتاب کے لیے نیک خواہشات  
کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیر نظر کتاب فیس بک گروپ ”کتبِ حنائہ“ میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔  
گروپ کالک ملاحظہ کیجیے :

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>



میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068





## اُستاد به واقعي اُستاد آهن!

اڄ وري سر مُشير عالم ٽيون چڪر ڪلاس جي چوڪرن کي معمولي حرڪت تي اُٿاري بيهاري، واري واري سان تڦون هنيون ته جيئن هو ٻڌائين ته پڙهائڻ دوران ڪهڙا چوڪرا پويان حرڪت ڪن ٿا؟

سر مُشير مُسلل تن ڏينهن کان ڪلاس جي چوڪرن کي چٻاڻون پئي هنيون. هو جڏهن به چوڪرن کي مارڻ جو ارادو ڪندو آهي ته اول پنهنجن ٻن چئن ٿلهن متارن ڪوليگس کي گهرائي منجهانئڻ سهولتڪاري، جو فائدو وٺي چوڪرن کي ڊاهو ڏئي، سندن سامهون بيهاري اچي ڪٽيندو اٿن. چوڪرا به ڇا ڪن؟ چئن اُستادن جي گهيري ۾ اچي ويڃڻ کان پوءِ مار لاءِ تيار ٿي ويندا آهن پر جوان جا پُٽ اهو هرگز ناهن ٻڌائيندا ته حرڪت ڪير ٿو ڪري؟ چوڪرن جو چوڻ آهي ته ”سائين هلڪي، ڦلڪي، حرڪت يا لڪڻ دوران پين ڪرڻ واري ڪڙڪي تي به ڪاوڙجي پوندو آهي ۽ کيس جُجڪي وٺي ويندي آهي ۽ پوءِ گهرايل سنگتين جو سهارو وٺي ڪٽڻ شروع ڪندو آهي.“

جڏهن ته مُشير جو وري اهو چوڻ آهي ته ”چورا پڙهن گهٽ ٿا پر هلندڙ ڪلاس دوران حرڪتون هيڪانديون ڪن ٿا. آءُ تنهن ڪري کين ڪٽيندو آهيان.“ پر اصل حقيقت ڪُجهه ٻي آهي. تيهن فيڪلٽي ميمبرن مان رڳو چئن اُستادن کي شاگرد تنگ ڪن ٿا. ساڳالھ سمجهڻ جهڙي آهي. در اصل ڪُجهه اُستاد نئين آيل پرنسپال جي سخت پر جائز پاليسيءَ مان تنگ آهن. نئون صاحب هن ڪاليج کان اڳ اُدمر جي ڪاليج جو پرنسپال هيو جنهن ساڳي پاليسي هتي به قائم رکي آهي. ڪاليج ۾ آمد ۸:۳۰ ۽ روانگي هڪ بجي تائين طئه ڪئي اٿائين. هو پڙهائڻ جي معاملي ۾ تمام سخت ۽ پابندي پسند آهي. داخلا ورتل شاگردن کي پنهنجي ذاتي موبائل تان ايس ايم ڪري ٿو. يارهين يارهين ڪلاس ۾ جتي اڳ ڏهه يارهين شاگرد هوندا هئا اُترجي اڄ Strength چاليهاري کان ڇڙهي وئي آهي. اڳي

سڄي ڪاليج ۾ ڪُل تي ڪلاس هوندا هئا جڏهن ته هاڻي ڪلاس جو تعداد ستن تائين وڃي پڳو آهي. هڪ اُستاد اڳ هفتي ۾ مُشڪل سان ٻه اڏائي ڪلاس وٺندو هو سو هاڻي ڏينهن ۾ ٻن کان تي ڪلاس وٺي ٿو ته سندس هير پڇي پئي. هُو هاڻي حواس باختا ٿي پيو آهي ۽ شاگردن کي نه پڙهائڻ ۽ پڄاڻڻ جا بهانا پيو ڳولهي. هيءُ مار ماران به انهيءَ سازش جي ڪڙي آهي. شاگردن کي پڄاڻڻ جي ڳالهه نئين صاحب هڪ گڏجاڻيءَ ۾ پڻ ڪئي هئي پر اُستاد به واقعي ئي اُستاد آهن جن صاحب جي اشارن قناعتين ۾ ڪيل ڳالهه کي ڪو وزن ئي نه ڏنو..... ائين ڪٿي چئجي ته ڪنگهيُن به نه! اُٿو نه پڙهائڻ، چوڪرا پڄاڻڻ واري مسئلي کي حتمي شڪل ڏيارڻ لاءِ زولاجي ڊپارٽمينٽ ۾ نجِي گڏجاڻي رڪرائڻ ٿا جتي آئيندي جو لائحہ عمل طءُ ڪن ٿا..... جنهن جي صدارت مُسلسل ۱۰ سالن کان گرلز ڪاليج بدران بوائز ڪاليج ۾ پوسٽنگ ڪرائي مزا ماڻيندڙ اسسٽنٽ پروفيسر ميڊم مستانا کان ڪرائي وئي جنهن کي آءٌ مَر ربحانا چوندو آهيان.

هن ميٽنگ ۾ سڀني شريڪ اُستادن کي پنهنجو موقف ۽ مسئلا پيش ڪرڻ جو حق ڏنو ويو. ميٽنگ شروع ٿي جنهن ۾ سڀ کان اول سر مُشير کي ڳالهائڻ لاءِ چيو ويو ته هُو پنهنجي تڪليف بيان ڪري. سر مُشير: ”اسان پنهنجا ضروري ڪم ڪاريون ڇڏي ڪاليج ۾ چورن کي پڙهائڻ ٿا اچئون! هي وري نياڳا اسان تي پڙهائڻ دوران پويان کِلن ٿا؛ مذاقون ڪن ٿا؛ پرپٺ سيٽيون ۽ چچڪرون ڏين ٿا! پڙهائڻ ۾ پرابلم پيدا ڪن ٿا! اوهان ٻڌايو هئڙن حرامي چوڪرن کي پڙهائڻ گهرجي؟“

”بلڪل نه قطعاً نه.....!!“ (ڪورس ۾ اُستادن جواب ڏنو). تنهن ڪري مُون کي به اهڙيءَ صورتحال کي مدِ نظر رکندي ڪلاس روم ۾ ”ضربِ چپاٽون آپريشن“ شروع ڪرڻو پيو..... مَن چورا مُنهنجيءَ مار کان ڊڄي ڪاليج ئي اچڻ ڇڏي ڏين..... پوءِ نه هوندا چورا ۽ نه ئي پاڻ کي روز پڙهائڻو پوندو! (نه هوندو بانس نه وڃندي بانسري)

سر مُشير کان پوءِ هڪڙي ڪانٽريڪچوئل اُستاد مُشتاق علي شان عُرِف گنجي ٽڪر ڳالهايو:

”اڄ مُون به پڙهائڻ دوران چورن کي چئي ڏنو ته چورا! پڙهڻ کان علاوه توهان کي پيو ڪو ڪم ڪار ڪونهي؟ نياڳا وڃي ڪو ڌنڌو ڌاڙي ڪريو! روز ڪاليج اچڻ ڪا چڱي ڳالهه آهي ڇا؟ پنهنجو وقت ٿا وڃايو!“

شان گنجي ٽڪر کان پوءِ سر عدنان دانهيو: اسان جي ڪاليج جي

نئين آيل پرنسيپال ياسر بلال صاحب اچڻ سان ئي منهنجي، روزي، تي لت هڻي ڪڍي آ! ڪاليج مان تائين ڪڍي پاڪ سنڌ اسڪول ۾ پڙهائڻ ويندو هئس جيڪي پُٽ جي في معاف ڪري ويهه هزار رُپيا به ڏيندا هئا! گهر جو خرچ خلاصو هلندو هيو! پيشان ماري ڇڏيائين! جهڙوڪر جيل ۾ واڙي ڇڏيو اٿائين!

سر عدنان کان پوءِ ڪاليجي گُلو بَٽ سر فياض پنهنجي تڪليف ٻڌائي: ”هيل تائين نوڪريءَ جا يارهن سال پڙهائڻ بنا ڪڍي ويو آهيان. ٽي ڪاليج ڏنا اٿن. ڪيئي پرنسيپال جهيلا اٿن..... اها ڪٿي ٻي ڳالهه آهي ته هن ڪاليج کان اڳ پونين ٻنهي ڪاليجن مان جبري رليونگ ليٽر سميت نڪتو آهيان پر ڪنهن به ڪاليج ۾ ڪونه پڙهايو اٿن..... ڀلا ڪجهه اچي ته پڙهايان نه! هي وري پاڻ واري نئين پرنسيپال صاحب مُون کي ڪلاس وٺڻ جو حُڪم ڏنو آهي..... مان به وري ڄاڻي ٻُجهي چورن کي اڙي..... چورا..... حرامي..... چئي مخاطب ٿيم ته چورن کي مُنيان لڳي ۽ سڌو وڃي صاحب کي دانهن ڏنائون ته سائين! ”سر فياض اسان کي گاريون ٿو ڏئي! اڙي، چورا، حرامي، کان سواءِ نالو نه ٿو وٺي ۽ پڙهائي به صحيح نموني نه ٿو! سر فياض کي وَنڊ ورهاست مُطابق نثر پڙهائڻو آهي پر هو ڪڏهن نثر ته ڪڏهن نظر ٿو پڙهائي! پڙهائي به پنهنجي، مرضيءَ سان ٿو! ڪلاس روم بدران زولاجي ليب ۾ گهرائي ٿو پڙهائي! ڪڏهن ڪٿان ته ڪڏهن ڪٿان ترتيب سان اصل نه ٿو پڙهائي ۽ هن جي پڙهائي اسان کي سمجهه ۾ نه ٿي اچي. سائين! مهرباني ڪري اسان کي سر فياض نه پڙهائي، اسان کي سر جُنيد يا سر جمشيد پڙهائڻ!“

چورن جي احتجاج کان پوءِ پاڻ پڙهائي، کان آزاد ٿياسون ۽ صاحب هفتي ۾ منهنجا رکيل چٽا ٽي ڪلاس به سر جمشيد حوالي ڪري ڇڏيا. دوستو! اوهان به نه پڙهائڻ لاءِ ڪا پلاننگ ڪريو، ڪجهه سوچيو! سر فياض کان پوءِ سندس اولڊ ايڇ محبوبا مَر مستانا رڙيون ڪيون:

ڀائرو! مُون به چورن کي جنسي ڪُڇيون گاريون ڏيڻ شروع ڪيون آهن ۽ ڄاڻي ٻُجهي پندرهن منٽ ڪلاس روم ڏانهن دير سان ويندي آهيان ته جيئن چورا سمجهن ته مير ڪاليج ناهي آئي ۽ ڪلاس مان نڪري گهرن ڏانهن هليا وڃن ۽ آءُ پڙهائڻ کان بچي پوان. باقي لاڳيتو ڏهن سالن کان انهيءَ مقصد لاءِ ئي ته بوائز ڪاليج ڏانهن ڀڳر ته جيئن ويٺي ونواهه ڪاوان ۽ دل پشوري ڪريان. مون هميشه يارهن جي ڪلاس کي پڙهائڻ جي



تقاضا ڪئي آهي جنهن ۾ به منهنجي چالاڪي رکيل آهي. هر سال وٽڪيشن ختم ٿيڻ کان پوءِ يعني پهرين آگسٽ کان اتر جا ڪلاس شروع ٿيندا آهن جڏهن ته فرسٽ ايئر جي داخلا کان پوءِ ئي آڪٽوبر مهيني ۾ مس اتر جا ڪلاس هلڻ لڳندا آهن جيڪي نومبر مهيني کان ئي باقاعدي هلڻ شروع ڪندا آهن ۽ چئن مهينن اندر مارچ تائين پڄاڻي، تي پهچندا آهن. مون کي سال جي ٻارهن مهينن ۾ ڪُل چار مهينا ئي پڙهائڻو پوندو آهي..... انهن چئن مهينن ۾ به آءٌ گسائڻ جا گر استعمال ڪندي آهيان. باقي عورتاڻو ڪاليج ڇڏي چورن ۽ مردن جي ڪاليج ۾ رهڻ جو ڪجهه ته فائدو ٿيندو نه! هٿڙي جنسي مت پيد ڏيکاري پنهنجو ڪم ڪيندي آهيان. مرد پرنسيپال عورت جو لحاظ ۽ خيال گهڻو رکندا آهن بنسبت عورت پرنسيپال جي. گرلس ڪاليج جون پرنسيپالون سُن وانگر ساهه ڪڍي ڇڏينديون آهن..... نه پڙهائڻ ته اهڙو ٻچڙو ٿيون ڪن جو ڪنهن کي ٻڌائڻ هٿ سان پنهنجي بي عزتي ڪرائڻ آهي..... انهيءَ ڪري پاڻ جهڙيون نه پڙهائيندڙ ماستريائون گرلز ڪاليج بدران بوائز جا پاسا وٺنديون آهن جتي وقت جي پابندي ۽ پڙهائي معاف هوندي آهي.

آخر ۾ خود غرض صدارتي دانهن کان پوءِ ميٽنگ اهو چئي درخواست ڪئي وئي ته هر ڪو پنهنجي پاران نئين آيل صاحب تي پريشر وجهي ۽ چوڪرن کي پڄاڻڻ جون ترڪيبون استعمال ڪري! باقي هيءُ نئون آيل نمازي صاحب فرمان قائد وانگر ڪم، ڪم ۽ ڪم، پڙهايو، پڙهايو ۽ پڙهايو واري تسبيح پيو سوري!



## دلير ملي ويو...

صادق روئي روئي پنهنجون اڪيون سڄائي وڌيون هيون..... گذريل رات جو ڪوئي ظالم ماڻهو، گهر مان، سندس پيارو ۽ گهر جو گذر سفر هلائيندڙ گهوڙو چوري ڪري هليو ويو هو. گذريل رات صادق گهري ننڊ ۾ ستو پيو هو. سندس زال کي به ڪا سمڪ ڪانه پئي ته ڪوئي ماڻهو ۽ ڪهڙي مهل اسان جو گهوڙو ڪڍي ويو هو.

جيئن ئي صبح جو کين جاڳ ٿي ته گهر ۾ گهوڙي کي نه ڏسي هڪ مهل پئي ساکت ٿي ويا هئا. پنهنجي اڪين تي يقين ٿي نه ٿي آين؛ پر پوءِ گهر جي دروازي تي جو نظر وڌائون ته دروازو کليل هو. صادق ان ئي مهل هاءِ گهوڙا شروع ڪئي ۽ وٺي ٻاهر گهٽي ۾ پڳو. ٻاڙي وارا ڪافي ڪٺا ٿي ويا. بس رڳو ڳالهون ئي ٿينديون رهيون. ڪنهن کي ڪابه خبر نه هئي ته صادق جو پيارو گهوڙو ڪئين چوري ٿي ويو هو.

صادق کي سمجهه ۾ نٿي آيو ته آخر سندس پيارو گهوڙو ڪيڏانهن ويو ۽ ڪير ڪاهي ويو. سندس ڪو به دشمن ڪو نه هو. گهٽي ۾ بيهاريل بگي جنهن ۾ صادق پنهنجي پياري گهوڙي کي ان ۾ ڍڪائيندو هو. ان بگي جي هڪ ڦيٽي ۾ زنجير سان گڏ ڪلف لڳل هو، تنهن کي ڏسي صادق جون اڪيون پرچي ٿي آيون. سڄي تر ۾ چٽو پڇو ٿي ويو، پر گهوڙي جو ڪٿان ڪو به ڏس پتو نه پيو.

صادق جا ننڍڙا ٻار اڳڻ تي راند روند ڪيڏي رهيا هئا؛ پر پئي زال مڙس گهوڙي جي غم ۾ غلطان هئا. جوڻس کي خبر هئي ته صادق کي گهوڙو بيحد پيارو هو، پر ان سان گڏ گهر جو سمورو گذر سفر به ان تي هو ۽ صادق ته پنهنجي گهوڙي کي پنهنجو وڏو پٽ سمجهندو هو ڇو ته سندس ۽ هن جي گهر جو پر جهلو به اهو ئي گهوڙو هو. پيار ۽ پاڻو مان مٿس نالو دلير رکيو هئائين. جوڻس پنهنجي پوتي سان پنهنجا ڳوڙها اڳهندي صادق کي چوڻ لڳي.

”جانب جا پي،! ٿورو صبر کان ڪم وٺ الله سائين ڪا نه ڪا سولي

وات ڪيندو..... ٿاڻي تي وڃي رپورٽ چونه ٿو ڪرين.....!“  
صادق سوچيو صلاح ته ڀلي آهي..... سو سڌو ٿاڻي تي اچي صوبيدار سان مليو ۽ کيس چوڻ لڳو.

”صاحب! گذريل رات منهنجي گهر مان ڪوئي منهنجو پيارو گهوڙو ڪاهي ويو آهي. صاحب! فرياد لاءِ آيو آهيان تدارڪ ٿئي.....“  
صوبيدار پنهنجين چونڊار شهرن کي چين تان اگر ڦيرائيندي صادق کي چيو.

”يار! صفا ڪمال ڪرين ٿو..... هتي ماڻهو ڪڇيو ۽ گر ٿيو وڃن ۽ تون وري پريشان آهين هڪ گهوڙي لاءِ، سو به هڪ جانور لاءِ.....!! وڃي ڪنهن پاڙي جي ڪنهن ڪنڊ پاسي ۾ ڏسينس ملي ويندي..... هتي جانورن جون نه پر انسانن جي مسئلن جو فريادون ٻڌيون وينديون آهن.....“  
صادق کي قرار نه آيو ته صوبيدار کي چوڻ لڳو.

”صاحب او صاحب! ائين سمجهو هو منهنجو پٽ هو. خدا را منهنجي مدد ڪيو. مون کي پنهنجو پٽ دلير موٽرائي ڏيو.....“  
صوبيدار ’دلير‘ لفظ تي ٿورو اچرج ۾ پئجي ويو صادق کي چئي ويٺو.

”ڳالهه گهوڙي جي پٽي هلي وري اهو دلير ڪير آهي؟“  
”صاحب! اهو نالو منهنجي ان پياري گهوڙي جو آهي ان کي پيار مان کيس دلير سڏيندو آهيان.....“

صوبيدار جيڪو اڄ جي دور جو ماڻهو هو جتي انسانن جو ڪو به قدر ڪونه هو اتي هي صادق کي ڏسي حيران پريشان ٿي ويو هو وري صوبيدار صادق کي چوڻ لڳو.

”ادا! منهنجي صلاح وٽ چڱو ٿيو جو تنهنجي ان گهوڙي مان جان چٽي ويئي الاڻي ته ڪيترن پيسن جو کاڌو چٽ ڪري ويندو هوندي. سو هاڻي چڱو ان ۾ اٿئي وڃي ڪو رکشو هلا.....“  
صادق کي صوبيدار جي ڪابه صلاح نه وئي ۽ صوبيدار کي چوڻ لڳو.....

”صاحب! هو مون تي ڪوبه بار نه هو جو منهنجي جان چٽي ويئي پر هو پنهنجو کاڌو پاڻ ڪمائيندو هو. اها هن ۾ همت هئي ته هو پاڻ کي پاليندو هو ۽ منهنجي گهر کي به هلائيندو هو. صاحب! هو منهنجو پٽ هو ۽ هو ڪو عام گهوڙو نه هو. منهنجي ڏک سک جو ساٿي هو.....!!“  
صوبيدار کيس چيو.

”ٺيڪ آهي..... ٺيڪ آهي.... تون هن اچي پني تي صحيح ڪري هليو وڃ..... اسان کي جئين ئي ڪا خبر پئي توکي اطلاع ڏبو پر تون به پنهنجي ڳولاه جاري رکجان؛ ماڻ ٿي نه ويهجان؛“

صادق جئين ئي ڪوري پني تي صحيح ڪئي ته صوبيدار کيس چيو.  
”لڪ پڙه جا پنج سو روپيا جمع ڪرائي وڃ..... وڌيڪ تنهنجي دليري کي دليري سان ڳولهن جي پرپور ڪوشش ڪبي.....“

صادق وٽ هڪ روپيو به نه هو..... جيڪو صوبيدار کي لڪ پڙه جا ڏي ها..... صوبيدار کي چوڻ لڳو.....

”صاحب! اڌار ڪيو مان نور مٺي سان ڏيندس هڪ پيرو منهنجو پٽ دلير ملي وڃي..... اسان ٻئي روز ڪمائيندا آهيون ته گهر جو چلهو ٻرندو آهي..... ڪالهه کان وٺي سڀئي گهر پاتي بڪ تي آهيون. خبر نه آهي ته الائي ڇا ٿيندو.....؟ صوبيدار صاحب ڪا واهر ڪيو..... توهان جا هٿ وڌا آهن..... منهنجي مدد ڪيو.....“

صوبيدار کي ڪاوڙ لڳي.....

”واه جو ٺهيو آهين يار هي ٿاڻو آهي ڪنهن واڻي جو هٿ نه جتان تون اڌار پيو ڪرائين..... هتي پنج سو رک نه ته هو رستو اٿي.....“

صادق گهر اچي..... پنهنجي زال سان حقيقت ڪئي ته سندس زال ڪمري ۾ وڃي پنهنجي شادي واري اڪيلي مونڊي ڪئي آئي جيڪا صادق شادي مهل هن کي پارائي هئي.

”جانب جا پي؛! هي وٽ سوني منڊي اسان جو دلير پٽ لپي پيو ته اهو اسان لاءِ ڪافي آهي هن منڊي کي ڳارائي..... پنج سو روپيا وڃي صوبيدار کي ڏيئي اچ.....“

صادق زال کي ڏاڍي نه نه ڪئي پر سندس زال صادق جي هڪ به نه ٻڌي مجبور ٿي ڪري صادق اها سوني مونڊي وڃي سوناري وٽ هڪ هزار ۾ ڳارائي پنج سو روپيا وڃي صوبيدار کي ڏيڻ لاءِ ويو ته صوبيدار کيس هزار ڏسي چيو هاڻي هڪ هزار لڳندئي مرضي هجي ته ٺيڪ نه ته اسان وٽ ٻيا ڪم به گهڻا آهن.....!“

آخر صادق مجبور ٿي ڪري اهو هڪ هزار صوبيدار جي حوالي ڪيو ۽ کيس ان مهل زال جا چيل جملا ياد پيس ‘اسان جو پٽ دلير لپي پيو ته اهو اسان لاءِ ڪافي آهي’ صادق صوبيدار کي نماڻائي سان چيو.

”صاحب! هاڻي ته منهنجو دلير پٽ ملي ويندو نه؟“

”ها ها چونه تون به ٿي ڏينهن رکي اچ اسان ڳولاه ڪيون ٿا ڳولهي“

ونڌاسون هاڻي تون سڪون سان هليو وڃ...!“  
په ٽي ڏينهن رڪي ڪري صادق ٿاڻي تي ويو... صوبيدار چيس...  
”اڄ يار اڄ تنهنجو ڪم ڪري ڇڏيو آهي... تنهنجو پٽ دلير ملي ويو  
آهي...“

صادق خوشي ۾ ڀرپور ٿي ويو.  
”صاحب! ڪٿي آهي منهنجو دلير پٽ؟“  
”اڄ ته توکي ڏيکاري اچان...“  
صادق خوش خوش ٿيندو صوبيدار جي ڪڍ هليو آيو... پهريان صادق  
سمجهو ته گهوڙو ٿاڻي اندر ئي ٻڌل هوندو، پر صوبيدار ٿاڻي کان ٻاهر  
نڪري په ٽي گهڻيون گذري هڪ وڏي پلاٽ تي اچي ويو. نڪ تي هٿ رڪي  
پري کان اشارو ڪري صادق کي چيائين.  
او هو جيڪو ڍانچو پيو ڏسڻ جنهن جي آخري بچيل سڄيل ماس  
کي ڪتا پٽي رهيا آهن. اهو ئي تنهنجو ’پٽ دلير‘ اٿي. مان هلاڻ ٿو مون  
کي وڌيڪ لک پڙه ڪرڻي آهي...“



## اجازت

نصرت خلاف داخل دعويٰ جي ڪيس جي اڄ فتويٰ هئي. زاهد جي وڪيل دعويٰ کي ثابت ڪرڻ لاءِ دليلن جا واهڙ وهائي ورتل فيس تي حق حلال جو ٺپو هڻي ويٺو ته نصرت جو وڪيل عينڪ کي ننڍڙي رومال سان اڳهي اکين تي رکي اطمینان سان اٿي جج اڳيان آرگيومينٽ ڏيڻ لاءِ اچي بيٺو. هن جي چاهي تي اطمینان ۽ لهجي ۾ ڌيرج هو. هن جج سان مخاطب ٿيندي چيو:

”جناب والا! منهنجو وڪيل دوست قانون، اخلاقيات ۽ انساني حقن جي پيچڪڙي پيو ڪري. هو منهنجي ۾ وڪلا تي ڪوڙو بهتان ڏئي ڪيس ڏهني ٽارچر ڏيڻ جي ڪوشش پيو ڪري. دعويٰ کي غلط ثابت ڪرڻ لاءِ توهان وٽ ڪهڙو ثبوت آهي؟“ جج ڪيس گهوري ڏسندي چيو.

”يور آنر! اها دعويٰ ڪوڙي آهي ته نصرت زاهد جي زال آهي. قانون ۽ شريعت جي حساب سان هو زاهد جي زال ئي نه ٿي سگهي“ وڪيل ڳالهائيو.

”پر نصرت جي ماءُ پيءُ سميت ڳوٺ وارن جون شاهديون زاهد جي حق ۾ آهن.“ جج ڳالهائيو.

”جناب والا! پوءِ به نصرت زاهد جي زال ئي نه ٿي سگهي.“ وڪيل جي لهجي ۾ اعتماد هو.

”نڪاح نامون به موجود آهي ۽ نڪاح پڙهائيندڙ مولوي جي شاهدي به دعويٰ جي حق ۾ آهي.“ جج پين وات ۾ ڏئي چيو.

”جناب والا! ان کان به انڪار نه آهي ته نڪاح به پڙهيو ويو آهي پوءِ به نصرت زاهد جي زال نه آهي.“ وڪيل ڳالهائيو.

”گهٽ ڪنوار جا وڪيل ۽ نڪاح جا شاهد به ته موجود آهن.“ جج ڳالهائيو.

”جناب والا! نه رڳو ايترو پر نڪاح جو حق مهر به لکيل آهي ۽ ڳوٺ وارن نڪاح جون خارڪون به کاڌيون آهن پر پوءِ به نصرت زاهد جي

زال نه آهي. ”وکیل ڳالهايو.

جج سميت ڪورٽ ۾ ويٺل سمورا ماڻهو حيرت جي ڪن ۾ غوطا کائي رهيا هئا، کيس سمجهه ۾ نه پئي آيو ته وکیل دعويٰ کي رد ڏيڻ بدران تسليم به ڪري پيو پر پوءِ به آخر ان سچائيءَ کان انڪار ڇو پيو ڪري؟

جج پين وات ۾ ڏئي کيس گهوري ڏسي رهيو هيو، عدالت جي ڪمري ۾ مٿان چانيل هئي زاهد جو وکیل اٿي بيٺو ۽ جج سان مخاطب ٿيندي چيائين:

”جناب والا.....! منهنجو وکیل دوست عدالت جو قيمتي وقت ضايع پيو ڪري وٽس دعويٰ کي غلط ثابت ڪرڻ لاءِ ڪو به معقول دليل نه آهي.“  
نصرت جي وکیل جي چپن تي طنزيه مرڪ وڪري وئي، هن ڏيرج سان ورائيو: ”جناب اعليٰ.....! عدالت سڳوريءَ جو آءٌ نه پر منهنجو وکیل دوست وقت ضايع پيو ڪري هو پاڻي پيو ولوڙي.“  
”پر، تون پنهنجي موقف کي آخر ڪيئن ثابت ڪري سگهين ٿو“ جج صاحب ڳالهايو.

”يور آنر آءٌ جيڪو ڪجهه چوان پيو اهو سچ آهي“ وکیل چيو.  
”تون ان کي ثابت ڪيئن ٿو ڪرين؟“ جج جي لهجي ۾ تجسس گاڏڙ بيزاري هئي.

”سر.....! مڃيان ٿو ته نصرت سان زاهد جو نڪاح به ٿيو آهي شاهد، گواهه به پنهنجي جاءِ تي ڪوڙ نه ٿا هڻن...!“  
وکیل ڳالهايو.

پر زاهد جي وکیل جملو اڌ ۾ ڪٽيندي ورائيو:  
”پوءِ نصرت، زاهد جي زال نه ٿي ته ڇا پيڻ ٿي؟“  
عدالت جي ڪمري ۾ ٽهڪڙو پئجي ويو ۽ ماڻهن جو پشڪو وڌي ويو جج ويٺلن کي خاموش رهڻ جي هدايت ڪندي چيو:  
”ڇا توهان جو آرگيومينٽ مڪمل ٿيا؟“ جج چيو.  
”يور آنر.....! آرگيومينٽ مڪمل نه پر شروع ٿيا آهن.....! سچ ته اڃا رهيل آهي.“ وکیل ڳالهايو.

”ته پوءِ مڪمل ڪريو...“ جج ڳالهايو.  
وکیل وٽيس باڪس ۾ بيٺل پنهنجو ۾ وڪلا نصرت ڏانهن ڏٺو جنهن جي چهر تي پریشانيءَ جا ڪي به آثار نه هيا. هن پنهنجي وکیل دوست ۽ نڪاح پڙهائيندڙ ملان ڏانهن معنيٰ خيز نگاهن سان ڏٺو ۽ چپن

تي مرڪ آئي جج صاحب سان مخاطب ٿيو؛  
 ”جناب والا!... آنءُ جنهن حقيقت کي پتو ڪرڻ لڳو آهيان، ان سان  
 نه رڳو زاهد، پر نڪاح پڙهائيندڙ ملان، شاهد، وڪيل ۽ نصرت جا ماءُ، پيءُ  
 ان ڏوهه ۾ گرفتار ٿي سگهن ٿا.“  
 ”ڪارڻ...؟“ جج وضاحت گهري.  
 ”جناب والا! شادي ٻن انسانن جي وچ ۾ زندگي گڏ گذارڻ جو هڪ  
 قانوني ۽ شرعي معاهدو هوندو آهي، جنهن ۾ ٻنهي جي رضا مندي شامل  
 هوندي آهي.“  
 ”پوءِ هي ڇا آهي...؟“ جج ڳالهايو.  
 ”گڏي گڏي، جو وهانءُ آهي، جنهن ۾ مائٽن جي خوشي نه آهي پر ان  
 جي قانوني ۽ شرعي حيثيت نه آهي ان ڪري ته گڏي ۽ گڏي، جي وهانءُ ۾  
 ساڻ سنوڻ ته هوندا آهن پر زندگي جي سچائي شامل نه هوندي آهي.“  
 وڪيل ڳالهايو.  
 ڪورٽ روم ۾ مڪمل مائٽر چانيل هئي، جج ٻين وات ۾ ڏئي سوچ  
 ۾ پڌل هيو، وڪيل ٻيهر ڳالهايو.  
 ”جناب والا!... ريتون رسمن مثبت به هونديون آهن ته منفي به، اهي  
 اسان جي سڃاڻپ جو حوالو ضرور آهن، پر قانون کان مٿانهيون نه آهن.  
 اسان وٽ اڄ به ريتن رسمن جي نالي ۾ مردن جي پيٽ ۾ عورتن کي  
 وڌيڪ پوڳڻو ٿو پوي.“ وڪيل ڳالهايو.  
 ”جناب والا!... منهنجي وڪيل دوست جي جذباتي تقرير جو هن  
 کيس سان ڪو به تعلق نه آهي، هو ڪورٽ سڳوريءَ جو وقت زيان پيو  
 ڪري.“ زاهد جي وڪيل ڳالهايو.  
 ”کيس سان تعلق آهي...؟“  
 جج زاهد جي وڪيل جي اعتراف کي رد ڪندي نصرت جي وڪيل  
 سان مخاطب ٿيندي چيو؛  
 ”توهان پنهنجي موقف کي جاري رکو.“  
 وڪيل جي چپن تي مرڪ وڪري، وٺي هن ڪجهه ڪاغذ جج صاحب  
 ڏانهن وڌائيندي ٻيهر ڳالهائڻ شروع ڪيو.  
 ”جناب والا!... منهنجي موڪلا جي شادي ڪرائي وئي هئي، هن  
 جي عمر ڏهه سال ۽ زاهد جي عمر ٻارهن سال مس هئي اها سندن راند روند  
 جي ٻاراڻي وهي هئي، هن ڀرت سرٽيفڪيٽ ۽ اسڪول سرٽيفڪيٽ ۾ ڄم  
 جون تاريخون درج ٿيل آهن. هن عمر ۾ ڪيل نڪاح جيڪڏهن قانوني ۽

شرعي طور درست آهي ته مان نصرت کي زاهد جي قانوني زال مڃڻ لاءِ تيار آهيان.“

جج نڪ تي رکيل عينڪ مان وڪيل جي پيش ڪيل ڪاغذن کي غور سان پڙهڻ لڳو. وڪيل ڪجهه ٻيا ڪاغذ جج ڏانهن وڌائيندي چيو:

”يور آنر.....! منهنجي موڪلا پڙهيل آهي، هن وقت سندس عمر ويهه سال اٺ مهينا آهي ان ڪري پنهنجي رضا خوشيءَ سان جنيد نالي نوجوان سان شادي ڪئي آهي جنهن جو قانون ڪيس پورو حق ڏئي ٿو.“

”جج جي چپن تي اڻ لکي مرڪ وڪري وئي، هو ڪنڌ جهڪائي ريڊر کي فتويٰ لکائڻ لڳو؛

نصرت پنهنجي ور جنيد ۽ وڪيل سان گڏ عدالت جي ڪمري مان ٻاهر نڪتي، ته سندس چهري تي سوپ ورنئون ريڪائون هيون.



## سوني

سوني سرواڻ کي وٺڻ وٺي آهي؛ جيڪا شايد اڃان نه موٽي. آئون سندس اوسيٽري ۾ بيٺو هوس، اسان کي عيد جي شاپنگ ڪرڻي هئي. رات ئي سوني چيو هو ته، هو جلد ئي سرواڻ کي اسڪول مان وٺي ايندي هو شام جي شفت واري اسڪول ۾ پڙهندو آهي. سرواڻ سوني ۽ منهنجي پيار جي اڪيلي نشاني آهي. مونکي اڃ به ياد آهي اها صبح جي پياري موسر جنهن جو آغاز پکين جي پيارين ٻولين سان ٿيو هو. هر طرف دلڪش سر سبز نظارا هئا، آئون پنهنجون ٻڪريون ساڻ ڪري ڇاڇي هشت جي ٻني تي پهتو هوس، روز جيان ڪوئي جي ڪپ تي ويهي هٿ ۾ ننڍڙا پينڊ ڪٽي پاڻي ۾ اڇلائي رهيو هئس، سندس انتظار ۾ ويٺل ان واٽ ڏانهن نھاري رهيو هئس، جيڏانهن هو روز سڳي لوڏائيندي، مرڪندي ايندي هئي. رنگ اچو کير جيان ته نه هئس پر ڏسندڙن کي وڻندو هو، اڪيون بادامي، آواز ۾ ڪوئل جي آواز جيان مناج پريل هئس؛ چڻجي ته سنڌ جي سونهاري سدا حيات شاعر شاه عبداللطيف ڀٽائي، پنهنجي شاعري، جو بنياد سنڌ جي انهن لوڪ داستانن تي رکيو آهي، جنهن ۾ مومل، مارئي ۽ سهڻي جهڙن ڪردارن کي سورمين جو مثالي درجو ڏنو پر منهنجي سوني منهنجي لاءِ حورن ۾ هڪ حور آهي ۽ شاه سائين جي سورمين جهڙي ئي آهي. سوني جي ئي خيالن ۾ گهر هئس ته سندس منهن آڏو ڇٻي وڃائي، خيالي دنيا مان ڪڍي هوش ۾ آندو ۽ پڇڻ لڳي.

”ڪهڙن خيالن ۾ گهر آهين سائين؟“

مون چاهي ٿي هڪ مخصوص مسڪراھت رکندي چيو:

”سوني منهنجي خيالن ۾ به تون سمايل آهين.“

”آئون ڪئين مڃيان؟“

”سوني دلين جي راز کان رب واقف آهي جيڪڏهن يقين نه ٿي

منهنجي دل کان پڇي وٺ جا هينئر تو وٽ آهي.“

هو شرمائندي ٻئي هٿا منهن آڏو ڏئي کلڻ لڳي، آئون ديوانن جيان

ان ڏانهن نھاري رهيو هئس جيئن ان پنهنجي منهن تان هٿا پري ڪيا ته

ان جي معصوم چهري تي ڊپ جي لهر اڀرڻ لڳي ۽ مون يڪدم سامهون  
نهاريو ته سندس چاچي شاهنواز جو ڪمدار 'ڪالو' اسان پنهني کي قهري  
نگاه مان ڏسندي ڪنڌ لوڏائيندو ڪاوڙ ۾ هليو ويو ۽ پوءِ سوني مونکي  
چوڻ لڳي:

”تون ڳوٺ ڇڏي هليو وڃ“

خوف ۾ بس ايترو چئي ۽ هو حويلي ڏانهن هلي وئي، ٻئي ڏينهن  
جڏهن آئون پنهنجون ٻڪريون ساڻ ڪري پنهنجي مقرر ڪيل جاءِ تي  
پهتس ته ان ئي ڪمدار سان منهن مقابل ٿيس، ڪمدار چوڻ لڳو:

”چورا رئيس کي تنهنجي عشق جي خبر پئجي وئي آهي؛ پنهنجي سرَ  
جي پرواهه اٿي ته ڳوٺ ڇڏي هليو وڃ نه ته رئيس جي خبر اٿي نه؟“... ڳيا  
ڳيا ڪري لاش لوڙهي ڇڏيندو.

ڪمدار جي ڌمڪي ٻڌي آئون ڊڄي ويس ۽ ڳوٺ ڇڏي شهر اچي  
پنهنجي چاچي ممتاز جي گهر پهتس، مون شهر ۾ پهريان مزدوري ڪئي ۽  
پوءِ آهستي آهستي نڪا ڪڍي سٺي آمدني ڪمائڻ لڳس ايترو ڪمائي  
ورتو جو اڄ شهر ۾ منهنجي پنهنجي جاءِ آهي، ڪجهه سالن کان پوءِ  
منهنجي ملاقات منهنجي دوست قربان سان ٿي آئون قربان کان جڏهن ڳوٺ  
جا حوال پڇڻ لڳس ته هو حيرت مان مون ڏانهن نهاري چوڻ لڳو:

”ڳوٺ جا ته حال حوال پورا آهن تنهنجي سوني جي شادي پئي ٿي  
تون هتي سڪون سان ويٺو آهين.“

اها ڳالهه ٻڌي آئون سوچڻ جي سمنڊ ۾ غوطا کائڻ لڳس، آئون اهو  
ڪيئن پلجي ويس ته سوني ڪهڙن حالتن ۾ هوندي؟ مان سوچڻ ۾ ئي گم  
هيس ته وري قربان چوڻ لڳو:

”خبر پئي آهي ته سوني جي زبردستي شادي پيا ڪرائين، پر هن  
ڪپڙا، زيور سڀ اڇلائي ڏنا اٿس، صرف زبان تي هڪڙي ئي وائي  
اٿس، ساڻ سائين منهنجو آئون ڪيئن ڪيان ڪنهن ٻئي سان شادي“ سوني  
جي لاءِ ته تون ئي سڀ ڪجهه آهين هن جي زبان تي صرف تنهنجي نالي  
جي وائي آهي، سندس ماءُ رحم ڪائي مونکي توڏانهن اماڻيو آهي پر تون ته  
هتي آرام سان ويٺل آهين؟“

آئون وڌيڪ ڪجهه نه ٻڌي سگهيس ۽ پهرين گاڏي تي ئي شهر کان  
روانو ٿي اچي ڳوٺ پهتس، مون حويلي ۾ ڪم ڪندڙ نوڪريائي کي  
سوني سان ملڻ جو نياپو اماڻيو، هو به منهنجو ٻڌي پنهنجي ماءُ سان گڏ  
حويلي جي پويان مون سان ملڻ آئي پر سندس چاچي اسان کي ڏسي ورتو ۽

ڪاوڙ مان چوڻ لڳو:  
”هن ٻڪرار کي ته آئون هينئر ئي پورو ٿو ڪيان وڃ ڪمدار بندوق  
ڪٽي آ“

سوني اهي جملا ٻڌي ڊڄي وئي ۽ پوءِ همت آڻي ورندي ڏني:  
”جيڪڏهن اهڙي ڳالهه آهي ته گنهگار آئون به آهيان، سزا جي حقدار  
آئون به آهيان هن کان پهريان مونکي ماري مٽي ماءُ جي حوالي ڪيو  
انصاف جي تخت تي ويٺل آهيو، انصاف برابري وارو ڪيو ڇاڄا“  
اهي جملا ٻڌي سندس چاچو ڪاوڙ منجهه ڳاڙهو ٿي ويو ۽ بندوق  
سوني جي سامهون ڪئي ته سندس سوني جي ماءُ آڏو اچي وئي ته سندس  
چاچو سوني جي ماءُ کي چوڻ لڳو:

”پري ٿي وڃ مائي اڄ پنهني کي ماري درياھ ۾ لوڙهي ٿو ڇڏيان“  
ان ڳالهه تي سوني جي ماءُ ڪاوڙ منجهان چوڻ لڳي:  
”اڄ سوني جو پيءُ جيئرو هجي ها ته تون هن جي تخت جو وارث نه  
هجين ها، ياد ڪر تنهنجي ڌيءُ به ته ڪمدار مولو سان پسند جو پرڻو ڪيو  
اتي غيرت ڪيڏانهن وئي پنهنجي اولاد جي لاءِ سڀ صحيح ۽ ٻين جي  
لاڙسپ غلط! خدا جو خوف ڪر!“

سندس چاچي شاهنواز سوني جي ماءُ جا اهي جملا ٻڌي ڪنڌ هيٺ  
ڪيو ۽ پوءِ سوني کي برادريءَ مان ڪڍي اسان پنهني کي زندگي جو سفر  
گڏ گذارڻ لاءِ ڳوٺ کان ٻاهر ڪڍي ڇڏيو ۽ پوءِ اسان ٻئي شهر اچي پنهنجي  
نئي زندگي جي شروعات ڪئي.

## ”ڏائي سو“

آچر جو ڏينهن هئڻ ڪري وريام کي دوستن سان ملڻو ۽ ريگل تي ڪتابن واري بازار ۾ ڪتاب به ڏسڻا هئا.

هن جا پگهار جي پڇاڙي، وارا ڏينهن ڏاڍا ڏکيا گذرندا هئا. هي ستين گريڊ واري هڪ سرڪاري نوڪري ڪندو هو، سندس پگهار مهيني جي آخري ڏينهن ۾ اڪثر ختم ٿي ويندي هئي. هي هڪ حساس طبيعت رکندڙ شخص هو، هي پنهنجي حساسيت سبب معاشري جي گهڻائي سان رلي ملي نه سگهيو. هن جا گهڻائي سبب هئا. هڪ ته معاشري جي ماڻهن جي گهڻائي گهڻين ڳالهين ڏانهن ڌيان ڏيڻ بجاءِ انهن کي نظر انداز ڪندي هئي.

وريام جو جن به ماڻهن سان تعلق رهيو، انهن جي اها ئي طرز زندگي هئي. هي پنهنجي مزاج سبب اڪثر پريشان ۽ اڪيلو رهندو هو. هن جا مٽ مائٽ پاڙيسري ۽ هن جي آفيس جا ماڻهو کيس اڪثر نظر انداز ڪندا هئا. ماڻهن کي سواءِ پنهنجي مطلب جي ٻي ڪا ڳالهه نه وڻندي هئي. خود غرضي سوسائٽي ۾ وڏي وڻ ٿي وئي هئي. گهڻا ماڻهو پنهنجي انهيءَ طرز زندگيءَ کي خراب ڄاڻيندي به انهيءَ ۾ اطمينان واري حياتي گذاري رهيا هئا.

وريام پنهنجي اندر ئي اندر ڦٽڪندو ۽ لڄندو رهندو هو. ساڻس ماڻهن جي روين سبب ڏک سندس پلٽ پيا هئا. زندگيءَ جي سفر ۾ ساڻس ڪم ڪندڙ ٻيا ماڻهو ڪائنس اڳتي نڪري ويا، پر وريام اتي جو اتي رهيو.

سندس خيالن، سوچن، احساسن کيس اڪيلو ته ڪري ڇڏيو هو پر هي ڪنهن به صورت ۾ سوسائٽيءَ جي ماڻهن جي ڪوڙي، هٿرادو زندگيءَ کان هار مڃڻ لاءِ تيار نه هو.

هي پنهنجي ڏک، ڏولون جو بار لاهڻ لاءِ پاڻ جهڙي ڪنهن احساس رکندڙ شخص سان ملي، پنهنجي دل جو بار هلڪو ڪندو هو.



هڪ ڏينهن هي اهڙي شخص سان اچي مليو هو، جيڪو سٺو صحافي انسان دوست هو، پر هو به وريام وانگر پنهنجي حساس طبيعت ڪري عاشي ترقي ڪري نه سگهيو پر هڪ مطمئن زندگي گذاري رهيو هو. ان شخص وريام سان ڳالهه ٻولهه کان پوءِ هن جي طبيعت جي -ساسيت سبب سندس ذهن مٿان چانيل بوجهه کي محسوس ڪندي کيس -ڪڻ جي صلاح ڏني.

هو پاڻ هڪ مشگزين جو ايڊيٽر هو، وريام کي پنهنجو وزيتنگ ڪارڊ ڏيندي پنهنجي آفيس اچڻ جي دعوت ڏني. ڪجهه ڏينهن کان پوءِ وريام هن جي آفيس وڃي پهتو ۽ پنهنجي لکڻ جي شروعات هڪ ڪهاڻي سان ڪيائين ۽ لکندي لکندي وريام اڳتي هلي، هڪ ڪهاڻيڪار جي طور پنهنجي سڃاڻپ ٺاهي ورتي. وريام پنهنجي ڪهاڻين جا پلاٽ سوسائٽي مان ڳولهندو وٺندو هو.

هر آچر تي پنهنجي لکيل ڪهاڻي پڙهي دوستن کي ٻڌائي اصلاح ڪري وٺندو هو. دوستن کي ڪهاڻي ٻڌائڻ ۽ ان تي ويچار وٺڻ هن جو شوق ۽ جنون هو.

وريام ڪاغذن وارو بيگ کڻي ٻاهر نڪتو پر اڄ مهيني جي 28 تاريخ هئي تنهن ڪري هن جا ڪيسا خالي هئا. گهران ٻاهر نڪرڻ مهل کيس اهو پتو هو ته سندس ڪيسي ۾ پئسا ناهن، پر پنهنجي شوق ۽ جنون لاءِ مارڪيٽ ڏانهن پيرين پنڌ نڪري پيو. هن جي گهر کان مارڪيٽ ٻن ڪلاڪن جي پنڌ تي هئي پر هي اهو سارو پنڌ لتاڙيندو جڏهن تي حصا ڪڍي ويو ته هن جي پيرن ۽ لڱن ۾ سور ٿيڻ لڳو، هڪ جاءِ تي وڻ ڏسي تنهن هيٺيان ويهي رهيو. ڳچ دير ڪهاڻي جو پلاٽ سوچيندو رهيو ته ذهن مٿان ڪو پلاٽ تري اچي، ته مان ڪهاڻي لکي وٺان پر ٽڪاوت سبب کيس ذهن تي ڪا ڪهاڻي لهي نه آئي. ڪجهه دير آرام ڪرڻ کان پوءِ اتي هلڻ لڳو ۽ اچي ڪتابن جي بازار پهتو. اڄ ڪتابن کي صرف سرسري ڏسندو پئي ويو. بازار ۾ پنهنجي اديب دوستن کي ڳولهندو رهيو پر اتي کيس ڪو به نظر نه آيو. دوستن جو ٿاڪ چانهه جي هوٽل کيس ساريل هئي، جتي اچي پهتو. هوٽل تي هن جو هڪ اديب دوست اڳ ۾ ويٺل هو. هي سلام ڪري اتي ساڻن گڏ ويٺو. جنهن سان گڏ هڪ ٻيو به همراھ ويٺل هو، هن جي دوست ويٺل همراھ سان سندس تعارف ڪرايو.

ڪجهه دير ويهڻ کان پوءِ وريام جي پيرن ۽ تنگن جا سور ڪجهه

گهٽ ٿيا ۽ ٻه گلاس پاڻيءَ جا پي پنڌ جو ٿڪ لڌائين. هن جي دوست چانهه جو آرڊر ڏنو. ايتري ۾ ٻه ٻيا اديب اچي پهتا ۽ ڪچهري مڃي پئي وريام جا ٿڪ به لهي پيا. ڪلاڪ ڪن ڪچهري هلي. وريام پنهنجي ڪهاڻي پڙهي کين ٻڌائي، ڪجهه دوستن تعريف ڪئي ۽ ڪجهه دوستن تنقيدي رايا ڏنا. وريام ڪهاڻي دوستن کي ٻڌائي پنهنجي ذهني تسڪين پوري ڪئي. ڪجهه دير کانپوءِ سڀئي دوست هوٽل مان اٿيا، وريام هوٽل ۾ اڪيلو رهجي ويو ويتر سندس پرسان اچي چيو ”ڏاڻي سو!“ وريام منجهي پيو!

فلئش فڪشن  
نينو ڪهاڻيون

## ڊاڪٽر عابد مظهر

”نه نه اهڙي ڳالهه ناهي!“

ستر سالن جي نامياري ليکڪ کان هڪ اخباري رپورٽر سندس پوري فيملي کان هن جي باري ۾ ايترو پڇيو وٺڻ آيو هو. نمائندي ليکڪ جي ٻنهي گهر وارين ۽ هن جي ٻارن کان پڇيو: توهان کي پنهنجي مڙس کان ۽ ٻارن کان سندس پيءُ بابت پڇيو توهان کي هن هيڏي ساري اديب کان شڪايت ته ڪو نه هئي؟ سڀني هڪ ٻئي ڏانهن ڏٺو ۽ وڏي گڏيل آواز سان چيو: ”نه نه اهڙي ڪابه ڳالهه ناهي.“

جڏهن ليکڪ کان هن پڇيو ته هن ورائيو: ”ناڪام ماڻهن کي زندگي کي سڦل بنائڻ لاءِ ڪوڙ ته ڳالهائڻا پوندا آهن، سو مان به چوان ٿو ته نه اهڙي ڳالهه ناهي!“

## فيڪ آءِ ڊي

هو گهڻن ڏينهن کان دوستن جي بدليل روين تي پريشان هو. پاڻ مان بيزار ٿي پنهنجا عيب ڳڻڻ شروع ڪيائين ته کيس عجيب خيال آيو. هن فيس بوڪ کولي لائبريري جي نالي سان فيڪ آئڊي ناهي دوستن جا پروفائيل ڏسڻ ويٺو. ڏسندي ئي ڏسندي کيس ڏسڻ وائسٽن دوستن ۽ چڱن پلن اديبن جون فرينڊشپ رڪيسٽون اچڻ شروع ٿي ويون. هن جي ايڪسپيڪٽ ڪرڻ سان اديبن کان جهڙوڪر گگ ڳڙڻ لڳي. هنجي رڳو فرمائش ڪرڻ جي دير هئي. پيار جي سنيهن سان گڏ ايزي لوڊ ۽ ايزي ڪيش جي پر مار ٿي وئي ۽ ان ڏني ئي هو فرهاد کان به وڏن وڏن جبلن جي ڪاٺڙ جا واعدا ڪندي هن کي شادي جون آفرون به ڏيڻ لڳا.

هن هڪ نظر پنهنجي اصلي آءِ ڊي تي وڌي ۽ ان کي ڏيٺ ڪري ڇڏيائين.

## ڏکيو فيصلو

هي انهن جو ٽيون ٻار هيو جيڪو ستن سالن جي وڏي انتظار کانپوءِ ٿيو هين. ٻي طرف بڪي جو سور هيس جيڪو جند ڪون پيو ڇڏيس. بڪي ٻروڏو پٿر هيس جنهن جو آپريشن ٿيڻو هيو خبر نه هيس ته پيٽ سان آهي ڪجهه هيڏين هن ڇڙهي ويا هيس ايڪسري جيڪو ٻار جي پيٽ ۾ هوندي نه ٿيڻ ڪپندو هيو ٿي ويو هيس. هڪ طرف سڪي لڌو ٻار ٻئي طرف بڪي جو سور ۽ علاج نه ڪرڻ جي صورت ۾ بڪي جي خراب ٿيڻ جو خطرو. ٻئي زال مڙس پريشان ٿي ويا. آپريشن به ته ٻار کي نقصان پهچائڻ جو سبب ٿي پئي سگهيو ويتر جڏهن ڊاڪٽر اهو ٻڌاين ته ايڪسري جي شعائن به متان پيٽ ۾ سرجندڙ ٻار کي نقصان پهچايو هجي ماءُ روئي، پيءُ ٻڌ ته ۾ هوسامهون ڏکيو فيصلو ڪرڻ هو.

..

## عباس سارنگ

### ”ڇڄل ڇپل“

ڇپل، پوءِ به هن جي پير ۾ گيسجي رهي هئي؛ جيتوڻيڪ ان ڇپل کي اٺن کان ڏهن تائين ٽاڪا به لڳي چڪا هئا. نيٺ ڪالهه شام جو وري ڇپل سندس پير ۾ يارنهنون پيرو ڇڄي پئي ته هن کي ڏاڍو غصو آيو هو..... ڇپل کي هٿ ۾ کڻي ڇوڻ لڳو.

”تون! ڀل مون کان بيزار ٿي ويئي هوندين؟“ پر مان توکان بيزار نه ٿيو آهيان.....“

هي وري ڇپل کي، پير ۾ پائي گسڪائيندو اڳتي وڌي ويو..... جيئن زندگي کي گسڪائي رهيو هو.

..



گهر ۾ ننڍا توڙي وڏا شادي جي ڪمن ڪارين ۾ مصروف هيا، پر پوءِ به وقفي وقفي سان سس سڳوري نهنن کي ڪم ڪندي طعنن ۽ مهڻن وارو ڪم به هلندو رهيو، نهنن به نئين نئين پرڻجي آئي هئي. ڏينهن، منجهند، شام گهر ۾ عورتن جي رش، چوڌر نوجوان چوڪرين جو ناچ گانا، کلڻ، ٽهڪ، ٽاڙين جو وسڪارو هيو، پڙي جو سامان ڏيکاريو ويو.

شام جو ٻڪي ختر ٿي وئي، باقي گهر ۾ سوڻيون ماساتيون وينيون هيون، جيڪي نياڻي جي حيثيت ۾ اچي رهيون هيون، جيئن ڌارين کي به خبر پئي ته ڪنوارائتا به ڌئين وارا آهن نه ڪو اڪيلا. اهو ڌمچر هلندو رهيو، ننڍيون وڏيون عورتن، چوڪريون خوشي ۽ چرچن ۾ مصروف هيون، رات جي ماني پوري ٿي، ڪن ٻارن کي ننڊ وٺي وئي، گهٽ وارا به پهچي ويا، وڌيڪ رش ٿي، ٻاهر شور شرابو برپا ٿي ويو، ڪن بوتلن جا منهن کوليا، فائرننگ ڪئي وئي.

نڪاح ٿيو، لائون ڏنيون ويون، صبح جو رخصتي ٿي، وري گهر ۾ چوڪرين جو پوڳ چرچي جو دور هليو، هڪ ڇڻي جي چوڙي پڄي پئي، رت نڪتي، چوڪرين ۾ ٻائيتال پئجي ويو. هڪٻئي کي گاريون ته ٿيون پر الزامن جي به برسات شروع ٿي وئي، هوڏانهن ڌاري پرڻجي آيل نهنن ٻڌندي دنگ رهجي وئي، ان جي اڳيان سڀ راز فاش ٿيڻ لڳا.

نهنن ٻڌندي رهي ۽ دل ٿي دل ۾ چوڻ لڳي؛ ڪالهه تائين سس ڏي، کي پاڪ دامن ٿي سڏيو، اڄو جهه گگدامر ٿي ڪوٺيو، پر هنن چورين جي جهيڙي بعد ڪنوار جي يارن جي ڊگهي قطار سامهون آئي، پيو ته نهيو هڪ ماسات به شامل هيس. فهرست ۾، بواءِ فريندز جي قطار...!!

ائين نهنن ٻڌي سڀ سوچيو ته سس دهمان ۽ رعب چو ڪندي هئي ته جيئن نهنن دهمان ۽ اثر ۾ رهي، چو ته هن جون گاريون، مهڻا ۽ طعنا اصل ۾ هن جو پنهنجو عڪس آهن.

..

**شاعري**

**غزل**

## ج ع منگھاڻي

وڌن ٿيون ڪڇن ٿيون وڪيون منزلن ڏي،  
ڏسن ٿيون تڪن ٿيون اڪيون منزلن ڏي.

چناسين رواجن سماجن سان نانا،  
سدائين مهاڙيون رڪيون منزلن ڏي.

مسين سوچ جا پيڪڙا ڪي ڪليا پي،  
وڌيون ڪيڏو اڳري سڪيون منزلن ڏي.

صدا ڪڙ ڪڍتن جي ڪن تي نه پهتي،  
اڪيون چنڊ بڻجي بڪيون منزلن ڏي.

منگھاڻيءَ سان پرتا سڀيئي نانگ واسنگ،  
هلياسين ڏنگيا يا ڪڪيون منزلن ڏي.

..

## اياز گل

لفظ هي سارا دوئي وارا، دلڙي تان ميسار ڪڏهن  
”صوفي صوفي“ روز ڪرين ٿو، صوفي ٿي ڏيکار ڪڏهن

پاڻهان پيار کي پري ڪرين ٿو، ويجهو ٿي اعزازن کي،  
مايا، من کان ڌار ڪري ڏس، دربارون، ڌتڪار ڪڏهن

توڪي پنهنجو پاڻ سڃاڻڻ ۾ سولائي ٿي پوندي  
آءُ فقيرن سان گڏ ويهي، چار گهريون کي گهار ڪڏهن

هي جوپن، هي جيون ڪنهن وٽ، ترسن کين سدائين ٿا،  
پنچين وانگر اڏري ويندا، آهن ڪنهن ٻئي پار ڪڏهن.

گل ٽڙن ٿا هر گهر ۾ ۽ واءُ سڳندون آڻي ٿي،  
واءُ پڇي ٿي مذهب ڪنهن کان؟ ان تي پي ويچار ڪڏهن.

جنهن هيڏو هيءُ نانءُ ڏنو ٿي، مڃتاون ۽ مان ڏنو ٿي،  
پنهنجي منڙي سنڌي ٻولي، سنڌي کين وسار ڪڏهن.

..



## ناج جو ويو

سوچون، وڃ- وراڪا،  
واڪا، واڪا، واڪا!

ويري، جي اک ميري،  
ڌرتي روز ڌماڪا!

ڏيه ۽ ڏٺ تي پهرا،  
سڀ جا نيٺ چٽاڪا!

پيرا، پيرا چاتي،  
ڪهڙا لڳندا ٿاڪا؟

واءِ سٿائو وريو،  
سڙه جا چوڙيو ساڪا!

شاعر! تنهنجا سڀنا،  
خالي ناهن خاڪا.

اُبتي ڳالهه نه مڃبي،  
ايڪا پوءِ ڏهاڪا.

\*\*

## اسحاق سميجو

اکثرين کي هئا حجاب کجه ۽ شيلف ۾ ڪتاب کجه،  
مهڪي هليا گلاب کجه ۽ شيلف ۾ ڪتاب کجه!

نيٺن جا رنگ رتا هيا، رت کي نشا پتا هيا،  
چلڪيل هيا شراب کجه ۽ شيلف ۾ ڪتاب کجه!

کڙڪيءَ ۾ رات ريشمي، ڌڙڪن ۾ راڳ پيروي،  
ڪمري ۾ ماهتاب کجه ۽ شيلف ۾ ڪتاب کجه!

مون وٽ هيو ئي ڇا پلا، هڪ نوڪري، کجه چوڪريون،  
ڪيئي گنه، ثواب کجه ۽ شيلف ۾ ڪتاب کجه!

دنيا منجهان نه هئڻ ڪڏهن، دنيا جيان لڳڻ ڪڏهن،  
چرڪي اٿيا هئا خواب کجه ۽ شيلف ۾ ڪتاب کجه!

جلون به چڻنگ هئي ڏني، جذبن جي جوان جهنگ کي،  
ماڻهو به هئا خراب کجه- ۽ شيلف ۾ ڪتاب کجه!

..

## نور خان نواب

تو سوا جڳ ۾ جيئن سولو نه آ،  
زهر جو پيالو پيئن سولو نه آ.

سار رک ملاح تون طوفان جي،  
سير کي چيري هلڻ سولو نه آ.

حوصلن جو امتحان آهي حيات،  
پل صراطن تان لنگهڻ سولو نه آ.

پيڙي ٿو پاڻي پنهنجي هٿان،  
هوش جو نعرو هڻڻ سولو نه آ.

هت ٿي ابراهيم جيڏي دل ڪپي،  
باه جي ويجهو وڃڻ سولو نه آ.

تون پڄاڻج پاڻ کي ڪورن اندر،  
عشق ۾ صدقو ٿيڻ سولو نه آ.

پنهنجي منزل ٺاه تون ميهارڻي،  
ڪڇ گهڙي- دريا ترڻ سولو نه آ.

لطف آهي يا ڪرم ان جو نواب،  
شعر ڪو ايئن لکڻ سولو نه آ.

..

## سميع بلوچ

تون چا جائين چاهي ٿيندي،  
روز محبت ناهي ٿيندي.

ريتون رسمون سڀئي لتاڙي،  
جڳ سان سينوساهي ٿيندي.

موت ته ماري پل پيو ماري،  
ٿيندي لاهي پاھي ٿيندي.

صورت ٿي سبحان سميع،  
دل تي نازل آھي ٿيندي.

••



## محمد علي پناڻ

وڊيو ئي ڪال سان ڪڏهين، نهارجي ته سهي،  
مهيني ماسي پر اي دوست، سنڀارجي ته سهي.

ڄمي نه ڏنڌ وڃي، خوف ان کي دل ۾ رکي،  
اندر پئي سارَ پرينءَ جي، اجارجي ته سهي.

اچي نه نظر پنهنون، ڏونگرين ڪٿي به مگر،  
وڏا ئي واکا ڪري، پر پُڪارجي ته سهي.

هيو جو ساڻ ڏکن ۾ پُل، گهڙي ڪا ڪٿي،  
وساري پِل اهو، يادِ ڏيارجي ته سهي.

وڇوڙي گهاو ڪي، تازو رڪڻ جي لاءِ مٺا،  
ٻيو نه پاڻي ئي پنڀڻين مان هارجي ته سهي.

## اقبال رند

اک مان تاري چڏبو آهي،  
ڳوڙهو هاري چڏبو آهي.

ايڏو ياد به اچبو آ ڇا؟  
اٿن به وساري چڏبو آهي؟

ڪنهن کي ايئن لنوائڻ معنيٰ  
ڪنهن کي ماري چڏبو آهي.

ڪاٻي ٻانهن سرانديءَ ڏيئي،  
سُور سمهاري چڏبو آهي

ڏينهن به لاهي چڏبو آهي،  
سج به اڀاري چڏبو آهي.

ڪوبه زمان، مڪان نه هوندي،  
وقت گذاري چڏبو آهي

..

## شوڪت اچڻ

توڪي ڏنر ته پيار ڪيم، بيوسيءَ ۾،  
هن دل تي اختيار ڏنر، بيوسيءَ ۾.

روڪي سگهيس نه پاڻ سندس سونهن کان پري،  
پوءِ پاڻ سان غدار ٿيم، بيوسيءَ ۾.

تنهنجي حسن جي ڳالهه ٿي پوءِ هوش ڪو نه هو،  
هي دل ٿي گرفتار چيم، بيوسيءَ ۾.

ايڏو ته سولو ڪونه هو، توکان پري رهڻ،  
دامن ٿيو تار تار، رنر بيوسيءَ ۾.

ڪلهه رات تنهنجي ياد پلايم پئي زور سان،  
پر دل ٿي اشڪبار، صنم بيوسيءَ ۾.

خود ڪي رکون ته غم کان پلا ڪيئن سو پري،  
هر گل سان گڏ آ خار، ڏنر بيوسيءَ ۾.

..

## ضمير ڦل

درد جو دنگ، ڪو ٻڌائيندئو؟؟!  
روح جو رنگ، ڪو ٻڌائيندئو؟

ڪو وڻيون ته نيٺ ڇو وڻيون؟!  
عشق جو انگ، ڪو ٻڌائيندئو؟

ڪيئن شماريان گناهه ۾ آخر؟!  
دائو يا سنگ، ڪو ٻڌائيندئو؟

رات اونداھ جا انيڪ قصا !!  
جوان اڙپنگ، ڪو ٻڌائيندئو؟

خواب گر ٿي ويا ڪٿي منهنجا؟!  
شهر يا جهنگ، ڪو ٻڌائيندئو؟

\*\*



## علي آকাশ

ڪيڏو نه رُني آهي، درويش جي تنهائي،  
ساڻي ٿي سَتي آهي، درويش جي تنهائي.

اڌ رات ستارن جي آڳر ۾ ڪهي ويو آ،  
پر ڪانه ڪُني آهي، درويش جي تنهائي.

اڃ چا ته پتنگن جا، هٿ ميڙ ميڙيا آهن،  
ٿي اڳ چُڪي آهي، درويش جي تنهائي.

موتي به ڪشي ايندي، جوتي به ڪشي ايندي،  
پاتار پُڳي آهي، درويش جي تنهائي.

دامن ۾ هزارين ئي ٿو ڦول ڏسي ٿڙندي،  
ٿي هير گُهلي آهي، درويش جي تنهائي.

دامن تيز هوا جهوٽا، هر ٽاڪ ويا ڪولي،  
پر ڪانه ڪُلي آهي، درويش جي تنهائي.

..

## ڊاڪٽر مبارڪ لاشاري

تٽي پوي شل غرور تنهنجو،  
ملي نه توکي سرور تنهنجو.

آئون وٽان ٿو معافي توکان،  
توڙي جو آهي قصور تنهنجو.

ستمر سهڻ ۾ سرور مون لاءِ،  
ستمگري تي عبور تنهنجو.

لکين سراسر سچ پيو مبارڪ،  
رهي سلامت شعور تنهنجو.

..

## مير صوبدار سعيد

لکيل لفظ منهنجا پڙهي سوچجان!  
پوئي جي، ڪو ڳوڙهو ڳڙي، سوچجان!

پنهنجن ۽ پروان ۾ ڪو فرق آ،  
پنهنجو پاڻ سان تون وڙهي سوچجان!

چاهت ۾ ڇاڇا نه سهڻو پوي ٿو،  
اچي جي ڪو ٿاڀو، تڙي سوچجان!

خوشين جي نشي ۾ جي اڳتي وڌين  
پنيان ڇا ڇڏيو ٿي، مڙي سوچجان!

لکين جا ته ليڪا ڪرين پيو ”سعيد“،  
بچي ڇو ٿي آخر پڙي سوچجان؟!

••

## سجاد ميراڻي

اڻ تارون ٿو تاري مونڪي،  
ڪندو ڪيئن ڪناري مونڪي.

جي هُو مونڏي ڪيئن اچي ٿو،  
کيس چئوس ته ماري مونڪي.

چئي ٿو هٽري ڪيئن ويٺو آ،  
طاقت ٿس ته اٿاري مونڪي.

اندر مان اونداھ ڪيڻ لءِ،  
پاڻ ٻري يا ٻاري مونڪي.

پاڻ ڪي جي هُوجي ڏسڻ ٿوچاهي،  
هڪر چئوس نهاري مونڪي.

اهڙي ياري ڪيئن ٿي گهري،  
مرڪي پاڻ روئاري مونڪي.

..



## سعید سومرو

هڏيون، گڏ بودلي جون ٿي رهيون آهن،  
قلندر جون اڪيون مرڪي رهيون آهن.

ٽريل ڇهرو ڏسي مزدور بابي جو،  
په ڏيئريون، گهري خرچي رهيون آهن.

ڪنا چورا! نه ڪر ڇڙواڳ چولين ڪي،  
مسين، ڪونجون به ٿي اڏري رهيون آهن.

نما سانجهي، ڪبيرڻ پيو لکي دوا،  
دعائون ڄڻ، نيون سرجي رهيون آهن.

پرائين چوڪرين سان ڇا ڪجن ليڪا،  
هتي پنهنجون به ڪٽ قرضي رهيون آهن.

وبائن جي وچوڙن ۾ ستر ٿي پيو،  
چميون، هن کي ڏيڻ وسري ويون آهن.

♦♦

## امداد سولنگي

هنيلي هرڻ جهڙي تون،  
مچيءَ جي ترڻ جهڙي تون.

لڳين ٿي لاڙ جو سرمو،  
اڪين ۾ ڀرڻ جهڙي تون.

لهين ٿي آبخارن جان،  
نديءَ جي ورڻ جهڙي تون.

گلابن پي ڪيا سجدا،  
نه ڪنهن تي مرڻ جهڙي تون.

وسايل ڏيه ساري لاءِ،  
پنپي تي ڀرڻ جهڙي تون.  
\*\*

## امجد دراني

تون جو مون کان چڳين زندگي وئي چڄي  
جڻ ته عابد کان هئي بندگي وئي چڄي  
رات روشن هئي ڏينهن ڏاڍو ڀلو،  
منهن تو ڇا ڦيريو رو سني وئي چڄي.  
مون ڏني ڪونڊ هئي، هئي جا ايڏي مٽي،  
مون خوشي کان وٺي هڪ مٽي وئي چڄي.  
ڪيڏو مشڪل ۽ نازڪ سڪيو فن هيو،  
پنهجي ٽهڪن جي تسبيح سبي وئي چڄي.  
هيءَ حياتي مون ٺاهي هندائي نه هئي،  
منهنجي اکڙن کي جيئن ئي وٺي وئي چڄي.  
ناز نخرا ڪڍي سونهن ٿلندي رهي،  
نفرتن جي ڏنگن سان ڏنگي وئي چڄي.  
جا مقدر مڪي سا اکين تي رکي،  
جا ملي هئي چڱي يا مٽي وئي چڄي.  
ڪلهه نه هئين تون ننڌڙ ڪو، نه امجد ٿئين  
سنڌ جي دانهن گونجي وڏي وئي چڄي.  
..

## قربان چنا

اداس چهرا کڻي گهمون ٿا،  
۽ گهاءَ گهرا کڻي گهمون ٿا.

رڳو وجهون ٿا پيا هٿ ٻرن ۾،  
هي خوف خطرا کڻي گهمون ٿا.

اڪين کان منزل پري نه آهي،  
اسان اجالا کڻي گهمون ٿا.

اڙي منافق! پري ئي وڃ تون،  
اڳ ئي خدشا کڻي گهمون ٿا.

زبان مٽري، اندر جا ڪارا،  
ڪهڙا اهڙا کڻي گهمون ٿا.

”قربان“ قسمت پلا ڇا مٽبي،  
رڳوئي ڪشتا کڻي گهمون ٿا.

..



## مجاز سولنگي

دل جو ڏڙڪو وڌي رهيو آهي،  
ياد ڪوئي اچي رهيو آهي.

ڪو وڃي پوپڻن کي سمجھائي،  
مڏ ڳلن مان ٽپي رهيو آهي.

چنڊ چانڊاڻ جا ڊگھيري هٿ،  
ڳل تنهنجا چُهي رهيو آهي.

ڪير هو بادلن جو رهواسي؟  
رقص منهنجو ڏسي رهيو آهي.

اڄ وطن کي وري اداس ڪري،  
سنڌ جو ڏاهو وڃي رهيو آهي.

ڪيڏو مان خوش ٿي ويو آهيان،  
درد مون کي ملي رهيو آهي.

ڇا ٻڌايان مجاز! ساحل کي؟  
سمند سارو ڪلي رهيو آهي...!

ڪو ته مون ۾ منتشر آهي رهيو؟  
دل جو ڌوڪو ۽ مڪر آهي رهيو.  
آسرن جي سڏ تي ويڃي هاميگر،  
عزم ۾ ڪو منتظر آهي رهيو.  
همقدم ٿيندو به ڇا رهبر اهو؟  
راه جو جيڪو پٿر آهي رهيو.  
دوست پرڪيا مون ته پو مونڪي لڳو،  
هڪڙو دشمن چاره گراهي رهيو.  
خودڪشيون ڄاڻي وڙهيون هون بڪ سان،  
منهجي مارن جو ئي ٿر آهي رهيو.  
جنهن به رستي ۾ ملي منزل سنڌ،  
سرخرو تنهنجو سفر آهي رهيو.  
پيڙ پل پل ڪيا پٿون پيراميگر،  
ضبط ظالم بيخبر آهي رهيو.  
عشق جي آڻت عقيدت کي چيو،  
ظرف ڪنهن جو بي خبر آهي رهيو.  
ڇا جهالت ڳوٺ جي سيماءَ پڏينئون؟  
هي وڏيري جو بي تر آهي رهيو.

..

## خالدہ نسرين

هر پل رهين ٿو تون ئي منهنجي ڏيان ۾،  
تر ڪي نه حال منهنجو هوندو گمان ۾.

آهي نه وصل هت جي پنهنجي نصيب ۾،  
ملنداسين نيٺ تون مان ٻي ڪنهن جهان ۾.

مونڪي ته هر ڪهاڻي پنهنجي لڳي ٿي پر،  
کردار ڪو ٻيو آ هر داستان ۾.

افسوس جن ڪي مون پي ڄاتو نه ٿي اهر،  
سي ئي سوال آيا هر امتحان ۾.

هن شهر ۾ رهن ٿا ماڻهو نه سڀ رڳو،  
انسان پي رهن ٿا ڪنهن ڪنهن مڪان ۾.

هاڻي نه گهر اچن ٿا مهمان شوق سان،  
اتساه پي ڪٿي آ ڪنهن ميزبان ۾.

نڪري وڃن نه رسمون ايتار جون ڪٿي،  
ٿي مهر جي ڪمي آ هر مهربان ۾.

هوشو نه دودو هيمن ڪو پي نه ٿو ملي،  
سوريه ٿي ڳوليان هر سنڌي جوان ۾.

دل سان ڏئي دعا ٿي نسرين هت ڪٿي،  
هر پل اوهان هجو شل رب جي امان ۾.

## مرتضي لغاري

مون جو هڪ پل ڏٺو دريءَ سامهون،  
تو به آءُ پڳو دريءَ سامهون.

وار وڪريل وڏوڙ ڇاتيءَ تي،  
ديد ۾ هو نشو، دريءَ سامهون.

سانجهه ويلى اداس روح ڪليو،  
چنڊ چهرو لٿو دريءَ سامهون.

پنهنجي ڪمري ۾ تون ملي نه سگهينءَ،  
تنهنجو ڦوٽو ڏٺو دريءَ سامهون.

ايئن سينگارجي نه بيهه اڳيان،  
تي نه ڪو حادثو، دريءَ سامهون.

..



## ياسمين چانڊيو

مون ته توکي آ روشني سمجهيو،  
پيار آهي ۽ بندگان سمجهيو.

لفظ خالي ته ڪونه هئا منهنجا،  
درد جي دل جي شاعري سمجهيو.

ڪائي چاهت پلا لکي آهي؟  
جيءُ جذبن کي عاشقي سمجهيو.

عشق ڪيڏو ڪيو اياڻو جو!  
هڪڙي ماڻهوءَ کي زندگي سمجهيو.

تو ڪٿي ياسمين آهي ڏٺي؟  
جنهن جدائي کي خودڪشي سمجهيو.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ  
سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنف کتاب کے لیے نیک خواہشات  
کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیر نظر کتاب فیس بک گروپ ”کتبِ حسانہ“ میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔  
گروپ کالک ملاحظہ کیجیے :

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>



میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068



رات جي رنگ کي جامر بڻجڻ ته ڏي،  
پرڀنٽڙا، منڌ سان ٿانءُ چلڪڻ ته ڏي.

تون اچي وئين پٿر، گئڻ ڪيان ڪا خبر؟  
ڪوڙ ٿيندا قصا، هانءُ ڌڙڪڻ ته ڏي.

سند جي سيند سڀندور ۾ مُرڪندي،  
وقت پيو تڙپندو، کيس سڀرڻ ته ڏي.

تو اڳيئي ڏنو فيصلو، ٺيڪ، پر،  
صبر ڪر ٿورڙو، مون به ٻولڻ ته ڏي.

تون جهڀيندين سمنءُ جو اجهل بال پر،  
مان ته سوچيان پيو، بال اچڻ ته ڏي.

تير تائيو اٿئي، ڏير ڌر، بي خبر،  
تير کان ٿئي تڪو، باز اڏڻ ته ڏي.

ڏوه ڏج پوءِ حياتيءَ کي، پارڪو،  
جامر پيتا اٿر جامر، بهڪڻ ته ڏي.

ڪائناتو نه سڳندون بڻي ڌڙڪنديون،  
وقت گل بڻجندو، لفظ ٻوڪڻ ته ڏي.

زندگيءَ سان نئين جنگ جوٽيون وري،  
مله 'سائر' ڪٽيون، انگ وچڙڻ ته ڏي.

\*\*

## علي زاهد

الائي ڪير آ مون ۾، الائي ڪير آهيان مان؟  
مٽيءَ تي ايئن پيو آهيان، مٽيءَ جو ڏير آهيان مان!

بقا جي بات ناهي ڪا، فنا جو فلسفو آهيان،  
ٽڪي پيو وقت آ مون ۾، جڳن جو ڦير آهيان مان.

اڪين جي ساهمي تنهنجيءَ عجب هي تور ڪٿي منهنجي!  
رُتي منهنجو وزن نڪتو! مون سمجهو سير آهيان مان!

اوهان جي ماڳ جا منظر مٺي ڏنڌلاڻبا هوندا،  
اگهو بس آرسي پنهنجي، گهڙيءَ جو مير آهيان مان.

هتي سج، چنڊ، تارن جون سموريون روشنيون اڪري،  
وڌيو هو بيخوديءَ مان جو عمر ڏي، پير آهيان مان.

پُڇو ٿا ڪير آ زاهد! ڪٿان آيو، ڪٿي ويندو؟  
الائي ڇو نه ٿا سمجهو! الائي ڪير آهيان مان!

..



## زاهد چامڙو

چو الائي قرار ڪونهي ڪو،  
پاڻ تي اختيار ڪونهي ڪو.

رج ئي رج زندگي آهي،  
پاڳ ۾ آبشار ڪونهي ڪو.

مٺ موڪيءَ جا ويس اڀري،  
پو به مون کي خمار ڪونهي ڪو.

ڪيترا گهاو دوستن جا ڳڻيان؟  
بس انهن جو شمار ڪونهي ڪو.

مان رنو رات بي حساب آهيان،  
هاڻ سيني تي بار ڪونهي ڪو.

چو نصيحت ڪيو پيا هن کي،  
يار زاهد ته ٻار ڪونهي ڪو.

••

## حسن پنھيار

هان روڪي به ڪير نيشن ڪي  
مڃ خدا ڪي نه ڦير نيشن ڪي!

هن طرح سان ڪجي سفر هاتي  
تي پون جي به پير نيشن ڪي!

چنڊ وانگر اڳيان ٽڪي بيٺي  
ننڊ ايندي! سوير نيشن ڪي!

اڄ نئين ڪا ڌمال هڻجي ٿي  
مان ٻڌان ٿو به چير نيشن ڪي!

قيد لمحو نه ديد کان ٿي ٿيو  
پڪ وٺي ٿي به دير نيشن ڪي!

راه دل جي اگر صفا ناهي  
ڪئن ڏسي هو به غير نيشن ڪي!

نيٺ عادي ٿيا موالِي هن  
هڪ چميءَ جي به هير نيشن ڪي!

واهرو پاڻ ماهرو آهي  
پو حسن سان به وير نيشن ڪي؟

..

## سڪندر شيخ

اوهانجي دوستي ٿو ڳوليان،  
ويائيل زندگي ٿو ڳوليان.

مند، مسجد، گرجاڻن ۾،  
امر بندگي ٿو ڳوليان.

چُهي پوپٽ، جي پرڙن کي،  
سڄڻ سادگي ٿو ڳوليان.

رشتن جي اونهاين ۾،  
آئون روشني ٿو ڳوليان.

صدين کان سنڌ ۾ سڪندر،  
امن ۽ آشتي ٿو ڳوليان.  
\*\*

## صدام حسين باغي

نه ئي ڪنهن جي نيشن ۾ پناهون مليون،  
نه ڪي پيار واريون نگاهون مليون.

اڪيلي جيون ڪي پري ڪوئي پاڪر،  
اسان ڪي نه اهڙيون ڪي پانهون مليون.

زندگي رول وانگي پئي رلندي رهي،  
ملي ڪا نه منزل، نه راهون مليون.

نه ٿيو درد دل جو تدارڪ به ڪوئي،  
دوستن کان به سڪڻيون صلاحون مليون.

شڪايت به ڪنهن سان ڪيون اي باغي،  
نصيبن ۾ آهنون ۽ دانهون مليون.

..



دل جي ڊيپ کي ٻاري ڇڏا!  
سارا سور، وساري ڇڏا!

درد جو دور آ، اچڻو ويڻو،  
هنيانءُ نه پنهنجو، هاري ڇڏا!

رڪ خوشين جو خيال، ذهن ۾،  
غر جا ڏينهن، گذاري، ڇڏا!

نيت جو آ، نتيجو سارو،  
پنهنجي. سوچ، سڌاري ڇڏا!

ماڻهن جي، عيبن کي ٿاري،  
خوبين ڏي به، نهاري ڇڏا!

هر منظر جو پسمنظر آ،  
عڪس اندر ۾، اتاري ڇڏا!

اپ تي اڏڻ جي، ڪوشش ڪر،  
سمجه سان حال، سنواري ڇڏا!

پنهنجون اکيون، کولي رک،  
ڊپاهڻ روح، پگهاري ڇڏا!

پل پل ۾، نئين تبديلي،  
ريت جا رنگ، وساري ڇڏا!

وهمن جي ور، ٿيءَ نه، ڪڏهن،  
”اطهر!“ جيءَ جيئاري ڇڏا!

..

اچي تنهنجي طبيعت ۾، وٺي توڙي رُڪائي آ  
محبت پوءِ پي تو سان، پرين پنهنجي اُهاڻي آ.

وساري پاڻ کي جيڪر، لکئون تنهنجي اداڻن تي  
کڻي اهڙو تصور اچ، اسان وٽ شام آهي آ.

نگاهن جا نياپا ۽، خماريل گيت جوڀن جا  
پڙهيا سي پيار مان هر هر، ٽڪاوت ٿي نه ڪائي آ.

ڪڏهن مدهوش رستن تي، ڪڏهن گُر تنهن جي يادن ۾  
اهو ئي پنهنجو جيون آ، اهاڻي دلربائي آ.

اڃان پي تنهنجي آلت جي، سموري مند گهرجي ٿي  
اڃان پي ساڻ تنهنجي جي، ضرورت ڪجهه سوائي آ.

ڪڏهن ٿا بار روزانو، وڇوڙن جا حياتي، تي  
ڪڏهن ڪنهن جي جدائي آ، ڪڏهن ڪنهن جي جدائي آ.

اسانجي عشق جو مذهب، رهيو بس حُسن ئي آهي  
اسانجي دل جي مڪتب ۾، اها جاري پڙهائي آ.

## آغا نیاز مگسي

روز مون کان لڳي ٿي رنل زندگي،  
هر گهڙي داءِ تي آ لڳل زندگي.

سونهن ۽ ساه تي ڀروسو ڪونه آ،  
هر قدم هر گهڙي آ ڊنل زندگي.

تو بنا هڪ قدم پي هلڻ ڪونه ٿئي،  
تو سوا ڄڻ لڳي ٿي ٽڪل زندگي.

يار جي ياد کان دل نه غافل ڪڏهن،  
روح پلجي نٿو هڪ نه پل زندگي.

سات ڪنهن جو هجي ڪو ته پنهنجو سڏي،  
خوبصورت لڳي هڪ غزل زندگي.

يار جي گڏ هجي موت پو پل اچي،  
شال آغا بڻي بي مثل زندگي.

## معشوق مُحسن ابرو

گُفتگو گل بَدَن کري ڄاڻي!  
اَنجَمَن کي عَدَن کري ڄاڻي!

پاڻي ڪڪرن منجهان لڀاڪا پيو،  
چَنَد روشن چَمَن کري ڄاڻي!

لاٽ لَب تي لَنوي لَطيفي تو،  
راڳداري جُمَن کري ڄاڻي!

رات جو روز ٿي مَچي مَحفل،  
گُذ سَتارا گَگَن کري ڄاڻي!

خيال ۾ سڀ کُتل ڪَوِيتائون،  
بحر پُورو وَزن کري ڄاڻي!

ڪوٽ ۾ قيد ٿي مَني مارئي،  
ياد پنهنجو وَطَن کري ڄاڻي!

••



## گلشن سنتو

ڪيڏا ته آهن نير اکين ۾،  
نئين ڪوتا تحرير اکين ۾.

گفتار ڪنهن جي ٻڌي آ،  
گهلي ڄڻ ڪا هير اکين ۾.

نيٺن جي ٻولي نيٺن پرکي،  
جڙي پئي آ تقدير اکين ۾.

نئون حوصلو نئين اميد،  
نئين جستجو تدبير اکين ۾.

مارن جا ڏک ڏوجهڙا ڏسي،  
تي پيا آهن جهير اکين ۾.

ڪيڏا ته آهن نير اکين ۾،  
نئين ڪوتا تحرير اکين ۾.

..

## اظهر ڀانيٺ

چنڊ چمڪي ڪئي رات ۾ رهبري،  
سمند بنواس جو مان تري ويس تري.

هي افق جو بدن آشفق ٿي ويو،  
سج-صحراحي، منجهان مڌ پيو آهي.

خيرپور جون ڪجيون ڇانورا ٿي پيون،  
عشق تازو ڪيو ”مير“، ”بالي“ وري.

مان منهوڙي وٽان مورڙا ٿو ڏسان،  
بيقران بحر جي موج ۾ جلپري.

ٿيا ”پٺائي“، ”اياز“ پٺ تي هن ڪٺا،  
وجد ۾ آ ”تمر“ پٺ پٺي آ ٺري.

ٿي گهلي پٺي گهلي دشمنيءَ جي هوا،  
مان ٿو کولي رکان دوستيءَ جي دري.

جو مٽر ميت جا گيت سرجي پيو،  
سو ڪوي پيار جو آهي ”اظهر“ چري.

..

## احساس ميرل

سندرو ٻڌي جي نڪرون ٻهڪن ٿا حوصلا،  
ڪيڏا هُجن جبل پل ٿيندا ذرا ذرا.

مون زندگيءَ جي لاهن چاڙهن تي سوچيو،  
ڪي ٿورڙيون خوشيون، ۽ لڙڪن جا قافلا.

ديوار چين کان پي ڳالهيون وڌيون وڌيون،  
هو سمنڊ پئي لڳا پر اندر جا ڪوڪِلا.

هن وقت جي منڊي ۾ چاچا وڪامجي ٿو،  
ماڻهو ڪٻي ويو ۽ پاڻي مٽي هوا.

جيون جي هڙ ۾ ”ميرل“ سانڍي ڇڏيا اتر،  
ڪُجهه تهڪ لڙڪ يادون چوڙيون ٽٽل ڇَلا.

••

بیرابطہ کنهن کوي سان کیچل کري ویو،  
سارو سماج ڏک جي هلچل کري ویو.

هن جي زبان تي هو انکار پیار جو،  
مون هام جئن پري هو گھایل کري ویو.

ان دل ویاچ یر آ گروي کري چڙي،  
جو علم ساڻ سڀ کي کامل کري ویو.

نظرون عجیب هن جون احساس یر هیون،  
چاهت نہ جیکو مون سان کو پل کري ویو.

سڏکان سڏن چو ان کي ڇا ایندو هو هلي؟  
تبسر بلال جیکو هیکل کري ویو.

..



## حبدار علي ٽوٽاڻي

نه دبئي نه دهلي دکن ۾ رهياسين،  
سدائين اباڻي ڪڪن ۾ رهياسين.

وري مارئي جان ٿيا قيد آهيون،  
زمانه عمر جي هٿن ۾ رهياسين.

نه ئي پٽ ريشم نه زيور وٺن ٿا؟  
اسان يار گيڙو لٽن ۾ رهياسين.

ڪري پير ڊگهڙا ستاسين نه هر گز،  
صدين کان سفر تي دڳن ۾ رهياسين.

پرين پاڻ پاڇا رهياسين سين جا؟  
مگر پاڻ پوءِ به برن ۾ رهياسين.

صدا تير تلوار جو هان نشانو؟  
وڏي سور صدمن ڏکن ۾ رهياسين.

\*\*

## گلاب چانڊيو

سند جي آن؛ سُرَ کان ٻاهر،  
ناهيان ناهيان شُورَ کان ٻاهر.

تو ته منصف! سزا ڪئي واجب،  
پر هيو هو قصُورَ کان ٻاهر.

تنهنجو قانون سند جي حق ۾،  
هوندو اڪثر آ، نُرَ کان ٻاهر.

جي؛ منهنجو ڪڏهن نه نڪتو آ،  
سند! تنهنجي حُورَ کان ٻاهر.

ناهي گذريو گلاب! هڪ پُلُ پي،  
سند جي پُورَ کان ٻاهر.

## ڊاڪٽر فاطمه حسن / شاھ زمان ڀنگر

اڪڙين ۾ نه زلفن ۾ نه رخسار ۾ ڏسجو،  
مونکي منهنجي دانش، منهنجي افڪار ۾ ڏسجو.  
رنگين لباسن ۾ گهڻا جسر ڏنا ٿو،  
پوشاڪ هيئر ذات جي اظهار ۾ ڏسجو.  
مضمون جا سوين رنگ جي ويهي ڪڍي لکجن،  
معنائون سوين شاعري تمار ۾ ڏسجو.  
اڌڪي نه سڄي، گهٽ، نه مٿي تون متان سمجهين،  
انسان هان انسان جي معيار ۾ ڏسجو.  
تارن سنڌي ڌرتي تي رکيا نيٺ قدر مون،  
ناهيا مان ڪڍي پوئتي، رفتار ۾ ڏسجو.  
انسان ۾ جيڪا به فضيلت رکي مالڪ،  
خود کي نه رڳو مونکي به ان ڌار ۾ ڏسجو.  
وگري جو وکر مان ٿيان، سو مون ڪڍي چاهيو،  
هئا ڪير وٺي آيا، مونکي بازار ۾ ڏسجو.  
الله اسان کي به بڻايو آ، مڃو جي،  
تعمير جون خوبيون انهي معمار ۾ ڏسجو.

..

شاعري  
نظم  
وايون  
كافيون

ۛ

بيون سنئون





## نظر

امداد حُسيني

هڪ وڏو جيل!

حياتيءَ کان وڏو ڪو جيل، ناهي  
وڏي ان جيل ۾ ٻيا ڪيترائي جيل آهن  
انهن ۾ ڪوٺڙيون آهن  
انهن جي ٻاهران ورديءَ ۾ پهريدار آهن  
شام ٿيندي ئي  
سڀن قيدي جي ٿيندي ڳڻپ آهي  
ڪنهن جهڙتي به ورتي ٿي وڃي تن جي  
ملاقاتي به تن جا ٿا اچن  
رشوت ڏئي تن سان ملن ٿا  
لڙڪَ  
لڙندڙ لڙڪَ کي  
ڳل تان لڙڻ کان ئي اڳي  
هٿ سان اڳهن ٿا - ۽ کلن ٿا!  
پر حياتيءَ کان وڏو ڪو جيل ناهي  
ٿا چئن قيدي جڏهن ان جيل مان تڏهن  
ملاقاتي نه ڪا رشوت  
نه ڪا جهڙتي نه ڪائي آپريشن  
۽ نه ڪاريون ڪوٺڙيون آهن  
نه وردي پوش پهريدار آهن  
۽ نه ڪا نمبر شماري  
ڪجهه به ڪونهي  
ڪجهه به ڪونهي  
ڪجهه به ڪونهي  
حياتيءَ کان وڏو ڪو جيل ناهي!  
..

## ڊاڪٽر آڪاش انصاري

اڙي دل، اڙي دل

اڙي دل، اڙي دل  
انهن ڏي به هل

جن جي نيٽن ۾ ناهي ڪو سڀڻو سجيل  
جن لاءِ ميگهاجي رُت ڪي منع آ ٿيل

جن جا سڀ ڀاڳ  
ڪاهوءَ جيان اجڙيل

جن جو هر ماڳ  
رڻ ڪڇ جي واري تتل  
ها انهن ڏي به هل

••

## مدد علي سندي

آءُ پيارا آءُ، ڏاڍو وياڪل ٿو گهاريان،  
ساري رات تڪيندي تارا، توکي ٿو ساريان.  
آءُ پيارا آءُ، تن ۾ تنهنجي آهي تات،  
ڪن وڻي ٿي مون کي ڪاٺي دين دنيا جي بات.  
آءُ پيارا آءُ، جدائي تنهنجي ڏاڍي ٿي ماري،  
ساعت ساعت دلڙي روئي، توکي ساري ساري  
آءُ پيارا آءُ ته ٻيهر نئون ڪجي نيهن،  
سانوڻ ڇا ڇا ساوڪ ڪئي آ، موٽي آيا مينهن.  
آءُ پيارا آءُ، ٻڌايان گجهڙيون ڪي ڳالهيون.  
تنهنجي خاطر سيني ۾ مون صدين کان سانديون.  
آءُ پيارا آءُ، اچي ٻڌ، منهنجا مٿڙا ميت،  
تنهنجي ورنهن لڻ، سڪيو آهيان ڇا ڇا سر منگيت!  
آءُ پيارا آءُ ٻڌايان ڪافيون ڪيئي وايون،  
تنهنجي جدائي ۾ اي جاني! روئي جي مون ٺاهيون.  
آءُ پيارا آءُ، ٻڌيان توکي شعر سمورا،  
تن ۾ ڪو به وڌاءُ نه آهي، تنهنجي پيار تي پورا آهن.

## نظر

### عطيه دائود

#### هڪ بوند جي اڃ...

هن جي فقط هڪ بوند جيتري اڃ ڪارڻ  
مان سمونڊ سمائي سيني ۾  
وڏ ڦڙي جيان وسندي رهيس  
ڇا جذبن سنڌي گجگوڙ هئي  
ڪنوڻ جيان تڙپي تڙپي  
نيشن ٿي هن کي ڳوليو  
بند دريءَ جي شيشي تان ترڪي  
منهنجي اظهار جا سمورا ذريعا  
مٽي منجهه ملي ويا  
منهنجي دل جي باغ مان  
هن محبت جو فقط هڪ گل پٽ ٿي چاهيو  
۽ مان گل مهر جي وڻ جيان  
پنهنجون سڀ محبتون، پل ڪن ۾  
هن جي اڳيان وڇائي ڇڏيون  
هن جي ظرف جي جهول ۾ سي سمائجي نه سگهيون  
عشق جا اهي سمورا داستان  
پيرن هيٺان لتاڙي ويا.

..



## نظر

ع.غ. تبسم

### ڌرتي سرتي

او ڌرتي! مان تنهنجي رڪت ڏيندي ڏيندي،  
رهندو مائي تنهنجو قرضي مان ٿيندو وڃان ٿو.  
منهنجي جسر واري مٽي، جي حصي کي،  
تنهنجا ٿورا، جو ڪن ۽ ڦيڪون ويلي،  
پنهنجي وارثي ڏئي تو پنهنجو بڻايو،  
نه ڄاڻان نه ڄاڻان تو ڪيڏن جڳن کان،  
منهنجو خاڪي ڄاڻو ٿهن ۾ لڪايو،  
منهنجي ڏات ۽ ڏات جو تاجي پيو،  
الولين، اداسين ۽ لوچن جو ڪيو،  
چٽين چاندوڪين، باڪ، بلبن جون جوتون،  
حياتي، جي حسناڪين واريون سوچون،  
وڇوڙي جا نوحا وصل جا جمالا،  
غلامي، غريبي، جا پٽڪا، پاڄارا،  
تاسارن چين ڪاڻ، سندو، جي ڌارا،  
بُڪئي پيٽ لڙ سَنگَ، ڪُڪن جا ٻارا،  
منهنجي پاڳي وارا بچائي رکيا ها،  
صدين کان تو مون لڙ سنڀاري رکيا ها،  
تبسم جي مٽي، پنوڙي تي ڌرتي،  
سندس جسر جي هر ذري تي او ڌرتي،  
مڃيان ٿو ته اٽڪٽ اڪيچار ٿورا،

مگر تنهنجو تنهن کان اُتر ٿورو آ جو،  
 منهنجين ڌڙڪنن، دل جي هر دڪدڪي جو،  
 جياپي، جنون جي سڄي فلسفي جو،  
 سڄي نيڪ نامي، ۽ شهرت جو مرڪز،  
 غزل، گيت، وائي، هائيڪي جو محور،  
 سدا سبز گوشي جي سهڻي، گهڻي، تي،  
 تنهنجي پاڪ پَوَرتا واري، مٽي، تي،  
 او ڌرتي!

جيڪا سونهن سرتي رهي ٿي،  
 سا سرتي ته منهنجي، سڄي شاعريءَ ۾،  
 سُندرتا جون سهسين رنگينون پري ٿي،  
 وڃن جان وراڪن ۾ گونجون گجي ٿي،  
 پري کان پُجي پاس گم ٿي وڃي ٿي،  
 صبح شام سوچن ۾ لهرون لڙهي ٿي،  
 شفق ۾ لهي چاندنين ۾ ڪڙي ٿي،  
 وڙهي ٿي رُسي ٿي، روئي پئي ٿي،  
 وڏي ڳالهه منهنجين ڳرائين وجهڻ تي،  
 وري ساڳيو مونسائڻ پرچي ٿي،  
 ستن ۾ سڀيتا جون سُرڪيون پري ٿي،  
 تنهنجين سانورين سانجهين ۾ او ڌرتي،  
 مٿين مَنڇلين مُوسمن ۾ او ڌرتي،  
 هُڳائڻ سان پنهنجي حسين بُت کي مهڻي،  
 سڳندڻ سان وهنجي سُرهاڻيون سڄائي،  
 سنڌوءَ ۾ تي گهاٽا ڊگها وار چوڙيون،  
 گجر هُرمچي تي نوان ويس پهريون،  
 ڪڪوريل انگن تي اُجاريون هلي ٿي،  
 چُنِي کي ڏندن ۾ چُڪي جو ٽڪي ٿي،  
 پٽيهَر پيرن ۾ جو پايَل ٻڌي ٿي،  
 ۽ توتي جڏهن ڊيل وانگر ٿلي ٿي،

تڏهن منهنجي اندر جي پاتال ۾ تون،  
او ڌرتي وٽر پُختيون پاڙون هڻين ٿي  
تون ادراڪ ۽ احترامن جون زياده،  
اڃان زور سان مون ۾ ميخون جڙين ٿي،  
تنهن بعد ئي تصوف جا ورد ۽ وظيفا،  
مٽيءَ سان ماڻهوءَ جي سنڀند جا سرشتا،  
چمين، چاه، چُسڪين گرائين جا ڪشتا،  
نبتن، پتاشن، گنديرين جا گڻڪا،  
انوکين ادائن، اشارن جا چڻڪا،  
او منهنجي مٺي سنڌ تون ٿي پئين ٿي،  
جيدل تيئن تون جند ساڻ جڙجي پوين ٿي،  
تون ايڏا جو اُتساه آڇيون اڇين ٿي،  
پساهن سان گڏ پيار پاڻو ڏين ٿي،  
تڏهن مان ته پنهنجيءَ سڄي شاعريءَ ۾،  
پنهنجي آپ بيتيءَ واريءَ ڊائريءَ ۾،  
ڳائيندو وڄائيندو لکندو وٽان ٿو.  
او ڌرتي مان تنهنجي رڪت ڏيندي ڏيندي،  
رهندو مان تنهنجو قرضي ٿيندو وڃان ٿو.

\*\*

وانگ زيني!

”سمند کان اڳتي“ ۾ آهي تو ڏني  
هُن پهاڙي پيچرن جي شاعري  
چنڊ تارن ۽ ڪتين جي شاعري  
بار ۾ نچندڙ سڪين جي شاعري  
ديس جي اُجرن پڪين جي شاعري -  
شاعري تنهنجي بسنتي ويس ۾  
پر اداسي آهي تنهنجي ديس ۾  
هر طرف آهيڊ ويئي هارجي  
هي به گهڙيون نيٺ وينديون گهارجي  
سُرخ ساڳيون حالتون اينديون وري  
۽ ڪورونا جي وبا جي آجپي تي  
دوستن سان ڪچهريون ٿينديون وري  
چين ۾ ڏسُ چنڊُ ساڳيو آ اڃان  
موسمن جو منڊُ ساڳيو آ اڃان  
سُرخ آهي ساڪُ تنهنجي ديس جي  
سُرخ آهي باڪُ تنهنجي ديس جي  
سُرخ تنهنجي شاعريءَ جو تن بدن  
سُرخ سارو وانگُ تنهنجو آ وطن  
هُو دنيا جي روبرو ٿيندو ضرور  
ديس تنهنجو سُرخرو ٿيندو ضرور.

..

## نظر

### سرمد چانڊيو

هيءَ صدي پي نه وڃي!  
ڏينهن هجي رات هجي  
پاڻ سفر منجهه سدا!

باک ڦٽي يا نه ڦٽي  
شام ڍلي يا نه ڍلي  
ڪير هجي يا نه هجي!  
ڏات ڏکيءَ جي ڪو صدا  
پاڻ سفر منجهه سدا!

شام ڍلي چنڊ ڪڙيو  
سال نئون ڪنهن نه ڏٺو.  
پونءِ سڄي باهه آلا  
وقت نديءَ جيئن وهي  
لهر مٿان لهر نئين.  
پهر مٿان پهر نئون،  
شهر نوان پاڻ گدا!  
پاڻ سفر منجهه سدا!



نيڻ تڪن راه پيا  
پيار ڏئي ڪير ڏئي!  
يار هجن سار لهن  
پنڌ ڪئي ڪين ڪئي.  
ڪير ڪري نينهن ندا  
پاڻ سفر منجهه سدا!

ماه ويا سال ويا!  
هيءَ صدي پي نه وڃي!  
هوءَ صدي ايئن وئي  
چور وڃي جيئن لڪي  
پيرُ جتي ڪو نه لڳي  
ڳول ڪجي ڪيئن ڪجي!  
شهر هجي ڳوٺ هجي  
ووڙ ڏجي ميل مڇي،  
وقت سنڌي ڪير ڪري  
ڪيئن ڪجي پار ڳلا  
پاڻ سفر منجهه سدا!

آءُ اهو ڏات ڏئي!  
بره وندو بات ڏئي  
ڏانءُ نئون وات نئين  
جات مٿان جات نيئن!  
ڪيڙ ڪري پيل ڪير،  
پيل ڪري ٿيل ڪير  
شال ڦٽن سونهن سلا  
رنگ رچن ڪيٽ پچن  
ونڊ وٺن شاه گدا!  
پاڻ سفر منجهه سدا!

..

## نظر

### روبينه اٻڙو

چِسَ پنهنجي جي درين مان ڏٺي ٿيو،  
رُوحَ جو پربت اڏاري واءِ ۾؛  
پاڻ مان نڪري اڏامي ٿي وڃان  
۽ وڃي ٿي دُور ڌرتيءَ کان پُڄان...

زندگي هڪ جنگِ جيئن مون ۾ لڳي  
مان بنا هٿيار جي وڙهندي رهيس؛  
هر محبت مورچي تي مينهن ٿي،  
ٿورڙو برسي وري رُڪجي وئي؛  
هر بغاوت مون اندر پلندي رهي؛  
مون بغاوت مان جنم ورتو هيو  
هاڻ جيون سان بغاوت ٿي ڪريان  
سال، هفتا سڀ اڏاري واءِ ۾؛  
پاڻ مان نڪري اڏامي ٿي وڃان  
۽ وڃي ٿي دُور ڌرتيءَ کان پُڄان...

ڪافڪا جي عُمر ۾ مون سان ملئين  
۽ ملي جولاءِ ۾ وڇڙي وئين!  
عُمر ساري گم ٿيل ڪنگڙ جيان  
توڪي مون ڳوليو هيو هر جاءِ تي!  
پر نه مونکي تون ملئين پنهنجي اندر  
۽ نه ڪنهن رستي گناهن جيئن گڏئين

پوءِ اڏاري توکي هڪڙي آه ۾!  
پاڻ مان نڪري اڏامي ٿي وڃان  
۽ وڃي ٿي ڏور ڌرتيءَ کان پُڄان...

مون پيانو تي اها ڏن پي ٻڌي  
جا اڃان ڪمپوز ڪنهن ناهي ڪئي؛  
مون اهو فوٽو به البم ۾ ڏنو،  
ڪنهن به ڪئميرا نه جيڪو هو ڪڍيو!  
مون اهو سجدو به ڌرتيءَ تي ڏنو  
ڪو خدا جنهن کي ملي ناهي سگهيو،  
هاڻي جيون ۾ رهي ڪجهه ڪين ٿو  
جنهن جي خواهش ۾ اڃان زندهه رهان  
هر خواهش خاڪ مان منهنجي ٿئي  
۽ دفن ٿيندي وري هن خاڪ ۾.....

هن جنم ۾ ننڍو مون ناهي ڪئي  
هاڻ گهري ننڍ ٿي مونکي ڪپي!  
سڀ گناهن ۽ ثوابن کي ٽڌي  
هاڻ جيون کي ڪتابن جيئن چنڊي  
آئون پاسي ۾ رکان ٿي پاڻ جي  
بند ڪمرو آسڻو وڪريو پيو؛  
آئون پنهنجي سوچ ۾ پيئي ٻُڙان  
آ مسلسل جنگ جاري پاڻ سان  
۽ پريل آ زهر جو هڪڙو گلاس!  
نوٽ ڪاڳر تي لکي پورو ڪيم،  
بس رڳو ان تي صحيح آهي رهيل....  
\*\*

پاڻ وهیڻی عورت

تو منهنجا هٿ ٻڌي ڇڏيا آهن  
ته جيئن آءُ ڪجهه لکي نه سگهان  
تو منهنجي چپن تي ماڻ جي مهر هنئي آهي  
ته جيئن آءُ ڪجهه ڪڇي نه سگهان  
تو منهنجي اکين تي انڌ جي پٽي ٻڌي آهي  
ته جيئن آءُ علم جي روشنيءَ کان وانجهي رهان  
تو منهنجي پيرن ۾ پيڪڙا پارايا آهن  
ته جيئن آءُ آزاديءَ سان چري نه سگهان  
پر تون ڪيڏو نه مجبور آهين  
تون منهنجي خيالن، خوابن کي  
منهنجي روح کي ته قيد نٿو ڪري سگهين  
آخر اهو وقت به ايندو، اوس ايندو  
جڏهن منهنجي هٿن ۾ ٻڌل جبر جي ڏور ٽٽندي  
۽ پوءِ آءُ اهو سڀ ڪجهه لکندس  
جنهن کان تون ڊڄين چرڪين ٿو  
جڏهن منهنجي چپن تي لڳل ماڻ جي مهر ٽٽندي  
ته منهنجا زنده لفظ توکي ماري مات ڪندا  
جڏهن منهنجي اکين تان انڌ جي پٽي لهندي  
ته منهنجو عقل ۽ علم توکي سنگسار ڪندا  
۽ جڏهن منهنجي پيرن جا ڪڙا لهندا  
ته منهنجي آزاديءَ جي رقص سان  
هيءَ ڌرتي ڏٻي پوندي!  
اڙي ظالم سماج! ڊڄ ان وقت کان

## نظر

### ڊاڪٽر جمال نقوي

هيءَ سچل جو ديس آهي  
هيءَ لطيف جي ڌرتي آهي  
جنهن سچ ۽ انصاف جي تعليم ڏني سڀني لاءِ  
پيار محبت جو پيغام ڏنو  
آهي هئا ايتارو روشنيءَ جا ڏيڻا  
سڀني ماڻهن جي خدمت ۽ سوجهري جا ڏيڻا  
انهن مان ڪيترائي جوڪيا، روشن ٿيا  
اهي ڏيڻا هزارين ڏيڻن کي روشن ڪندا  
امن جو پيغام ساري دنيا ۾ پکيڙيندا  
جيڪو عيان ٿيو اهو راز پڌائيندا  
جمال اسان ستنن کي پيا هو جاڳائيندا.

..



## نثري نظر

### ڊاڪٽر مشتاق ڦل

#### هڪ نئون رنگ

پيار جي ڳولا،  
گهر جي تلاش  
۽ ديس جي سڪ پکين کي به لڳندي آهي  
دوست!  
مان اڪيلائي، ۾ روئندو آهيان  
ته سمنڊ مون سان ڳالهيون ڪرڻ ايندو آهي!  
هو نفرت جي باه ٻاريندا آهن  
ته مان وري برف وانگر ڳرڻ لڳندو آهيان!  
هو مون کي ماريندي ماريندي،  
پاڻ مرڻ ڪندي، تي پهچڻ وارا آهن  
پر مان وري هنن ڏانهن ڌيان ڏيڻ بدران  
تڏ به ڏڪندڙ ڪراڙي عورت کي  
مرڻ کان بچائڻ لاءِ  
پنهنجا هٿ، پنهنجون اکيون ۽ پنهنجا چپ  
باري رنگ رنگ ٿي اڏري رهيو آهيان!  
..

## نظر

ڊاڪٽر خسانه پريت

اسين ڪٿي ڪٿي آهيون -!

مون کان ڪنهن شخص پڇيو هو؟  
اسين ڪٿي ڪٿي آهيون!  
مان ان کي ڪينئن چوان پيارا اسين ڪٿي ڪٿي آهيون  
جتي ڪو ظلم ٿئي ٿو اسين اتي به هوندا هون  
جتي ڪو لڙڪ لڙي ٿو اسين اتي به هوندا هون  
جتي ڪو چاڪ چڪي ٿو اسين اتي به هوندا هون  
جتي ڪو ساٿ ٿئي ٿو اسين اتي به هوندا هون  
جتي اوهان آهيو موجود اسين اتي به هوندا هون  
جتي اوهان جون سوچون هن اسين اتي به هوندا هون  
چيائين تنها جيون لاءِ اهو ممڪن ئي ڪونهي ڪو  
چير جذبا سڃا آهن ته ڇا ممڪن ئي ڪونهي ڪو  
اسان سنڌ لاءِ جيون ڪي ڪري ٽڪرا ڇڏيو آهي  
اسان سچ لاءِ جيون ڪي ڪيو حصا حصا آهي  
جتي آگهرج اتي ان کي ائين ورڇي ڇڏيو آهي  
مگر هيءُ دعويٰ آ پنهنجي ڪڏهن فنا نه ٿينداسين  
ڪڏهن فنا نه ٿينداسين ڪڏهن فنا نه ٿينداسين  
جيون جو هر هڪ ٽڪرو نئون سيلاب آڻيندو  
ٻڌائي ڇڏهن آمر کي ته انقلاب آڻيندو  
ڪو انقلاب آڻيندو ڪو انقلاب آڻيندو.

نثر نظر

ضياء ابرو

سمند جي ڪناري تي  
پنل واري، مٿان  
تنهنجن پيرن جا  
نشان!  
مونکي ائين لڳا  
ڇڻ ته  
ڪنهن اسٻرا  
يا ڪنهن جل پري،  
رات سمند مان  
نڪري  
واري، تي يسار ڪيو هو  
تون پڪ ئي پڪ  
ڪا جل پري آهين!

..

## نظم

### هدايت بلوچ

پيار ڪر، پيار ڪر.

پيار ڪري پيار ڪر،  
سوچ ويچار ڪر،  
ڪين انڪار ڪر،  
پيار ڪر پيار ڪر.

پيار ماڪين مٺو.  
پيار مصرين گڙيون،  
وير وه جون وٿيون،  
پيار موتين لڙهيون،

سوچ ويچار ڪر،  
ڪين انڪار ڪر،  
پيار ڪر پيار ڪر،

پيار مسلم سان ڪر،  
پيار هندوءَ سان ڪر،  
پيار پنگيءَ سان ڪر،  
پيار جهڙي سان ڪر.

\*\*

## نظر

### صدا لاشاري

#### سچ!

ديس جا سور سوايا آهن  
هر ڪو ماڻهو گهڻو پريشان آ  
پوئي پي توکي ڪل نه ڪائي پئي  
روز بک تي مري رهيا آهن  
ڪيت جيڪي پيا اپائين ٿا  
روز بيمار ٿي رهيا آهن  
جن هميشه ڪئي هئي خدمت  
پر توکي ڪابه ڪل پوي ئي نٿي  
ملڪ جي مالڪي جي همار هئي  
تون اڃان تائين ڇو ٿڪو ناهين  
ماڻهو ڪنهن جا؟  
هي ملڪ ڪنهن جو آ؟  
ٻڌ ڪٿي ديس جي صدائن کي  
ٿورڙو تن جو حق ڪٿي رک تون  
ٿورڙو ڌيان جي ڌرين به ڪٿي  
آبرو اڄ به بچڻ ممڪن آهي  
ها مگر سچ انهيءَ لاءِ شرط آهي...

\*\*



نثري نظر

زيد پيرزادو

پيار ڇا آهي؟

پٽ جي پيءُ کي  
ڏنل اوچتي چمي  
پيارئي ته آهي

رات جو دير سان  
ڏي، جي مٽي تي  
هٿ رکي  
بخار محسوس ڪرڻ  
پيارئي ته آهي

پيڻ جي شادي تي  
رخصتي وقت  
ڳوڙها اڳهڻ  
پيارئي ته آهي

پرديس ويل پٽ سان  
فون تي ڊگها ڊگها  
احوال وٺڻ  
پيارئي ته آهي

سالن پراڻي ڪنهن وٺڻ جي  
ڪٽجي ويڃڻ تي نظر لکڻ  
پيارئي ته آهي

دوست جي هرون پروڻ  
وڪالت ڪرڻ  
پيارئي ته آهي

ڪنهن کي تڪليف ۾ ڏسي  
پاڻ تڪليف محسوس ڪرڻ  
پيارئي ته آهي

..

## نثري نظم

### امر پيرزادو

#### موت جي مند

اسان جي  
فرينڊ لسٽ ۾  
هاڻي  
مري ويل دوستن  
جو تعداد  
جيئن کان  
گهڻو ٿي ويو آهي  
دوستي  
مروڻ سان  
ڊليٽ ڪري  
ناهي سگهجي  
روز ڪو دل گهريو  
پنهجي تصوير  
جو ڪتبو کڻي  
سوشل ميڊيا جي  
تعزيتي بڪ تي  
لڙڪن سان لڪرائي پيو  
سوشل ميڊيا  
قبرستان تي وئي آهي  
ڪنهن پياري کان  
موڪلائي به نه ٿو سگهجي

ڪنهن جي  
 جنازي ۾ ويڻ  
 بداخلاقي  
 ڪنهن سان  
 روبرو تعزيت ڪرڻ  
 عيب ٿي ويو آهي  
 آئسوليشن ۾  
 ڏکين ساهن سان  
 جيئندڙ ماڻهن  
 گهر پاتين جا  
 ساهه ڪڍي ڇڏيا آهن  
 چوڏهن ڏينهن  
 چوڏهن سال ٿا لڳن  
 ننڍا ٻار  
 مائرن کان سوا  
 سمهڻ تي  
 حيران آهن  
 انهن لاءِ ننڍي  
 ڊچ جو خواب ٿي وئي آ  
 سڀاڻي ڇا ٿيندو  
 ڪنهن جو وارو ايندو  
 موت جي مند ڇانئيل آهي  
 بازارن ۾  
 موت جي خريداري  
 جاري آهي  
 موت جي وڏي سيل لڳل آهي  
 زندگي  
 ختم ٿي رهي آهي.....!!

..

## پشپا وٺپ

( Blessing in disguise )

### گجھي رحمت

زندگي چپ چاپ ۽ خاموش آهي  
هل هلان، گهماگهمي ۽ پيهه پيهان، گهٽ ٿي وئي آهي.  
آسمان وڌيڪ نيرو ۽ صاف ٿو لڳي  
جهرڪيون جي ڪڏهن ڪڏهن ڏسبيون هيون  
هاڻي سڄو وقت چهچائين ٿيون  
ڇڻ ته ڪن ئي ڪاٺي ويون آهن.  
الائي ڪهڙا ڪهڙا نت نوان پڪي  
پنهنجي ماڳن تي موٽي آيا آهن.  
واهن ۾ مڇيون موٽي آيون آهن  
پهاڙن تان چيتا، هرڻ، سها ۽  
باندر لهي آيا آهن،  
هاڻي هو پنهنجو پاڻ کي  
محفوظ سمجهن ٿا.  
اڃانڪ هئا جي گدلاڻ جيڪا  
انتهاڻي درجي جي ٿي وئي هئي  
گهٽجي وئي آهي.  
ڪڏهن بيهي ڪري آسمان ئي نه ڏسي سگهيو هيو،  
هڪ ڪم کان پوءِ، ٻيو ڪم تيار جو هو،  
هاڻي بيهي سگهجي ٿو،  
وهنوار جون ننڍيون ننڍيون لعزشون  
پلون، چڪون سڌاري سگهجن ٿيون،  
اهو سوچڻ جو ٽائيم ملي ٿو  
روح کي ڦولھڻ جو وقت ملي ٿو.  
غلط آهي. پر چوڻ تي دل چوي ٿي  
ڪروڊنائين.....  
گجھي رحمت ته نه آهي !!



## نظر

مصطفى انتر

### حياتي، جو ڏاڳو

چڙو چڙ حياتي، جو ڌار- ڌار ڏاڳو آ  
رُج ۾ رکيو چاهي، اُج ۾ ڪنڀان ڇا؟  
مان سڏيان پلا ڪنهن کي، سِج ۾ ڪنڀان ڇا؟  
مان ڪڙهان ڪڙهان ڪيسين، ٿورڙو لڙيو آهيان!  
ڪاڙهي ڪڙهي ڪيڏو، ڪيترو ڪڙهيو آهيان  
مان پڙهان، ڪڙهان ڪيسين ٿورڙو سڙيو آهيان  
ڪيترو اُڪيلو مان، ڪيترو وڙهيو آهيان  
روح جي رحل تي آ عشق جو سبق ساڳيو  
درد جو رهيو روشن ها اهو طبق ساڳيو  
جنگجو ڪٿي جذبا! مان ڊڪان- ڊڪان ڪاڏي؟  
مان سڙان پڇان ڪيڏو، پُڇ ۾ بچايان ڇا؟  
اُج ۾ چُڀايان ڇا؟ رُج ۾ وِڇايان ڇا؟  
تو کي سڀ خبر آهي، پاڻ وٽ بچايان ڇا  
آئون پنهنجي باري ۾، ڇا اڃان ٻڌايان ڇا؟  
مان رڙي- رڙي هيڪل، ڪيترو ٻڻو آهيان  
واٽ ڪا ملي پئي شل،  
ڪين مان ٽڪو آهيان  
ڇا چوان ته منصف ٿي بخت ۾ نياڳو آ  
پر! اهيا خبر آهي، وقت پر نه ساڳو آ  
ڪيترو به جاڳان ٿو! گول گول پاڳو آ  
چڙو چڙ حياتي، جو، ڌار - ڌار ڏاڳو آ ... !!!  
..

## ڪافي

### قادر بخش سومرو

چڱن ۾ چڱائي پلي جي پلائي،  
اي مالڪ اسان جا هي تنهنجي خدائي!

هتي ماڻهو هڪ ٻئي کي ڏکڙا ڏين ٿا،  
نه ڪنهن جي ٻڌن ٿا، نه ڪنهن جي سهن ٿا،  
رڪن ڪونه ڪائي، ذري جي سچائي،  
اي مالڪ اسان جا، هي تنهنجي خدا!

برا ڪم هو ڪهڙا، سڄو ڏينهن ڪن ٿا،  
انئي پهر گجهه جيئن ڪنن تي ڦرن ٿا  
محبت نپائي نه، الفت اگهائي،  
اي مالڪ اسان جا، هي تنهنجي خدا!

ڪئي جستجو آهي دنيا ۾ هر دم،  
خطا ڪانه ٿي ڪا، خطا ايءُ ڪردم  
۽ رهبر پساڻي، ڪا ٿيندي سڻائي،  
اي مالڪ اسان جا، هي تنهنجي خدا!

ڏنا مون به انسان زماني ۾ ”قادر“،  
سوين ڪيئي غاصب، سوين ڪيئي نادر،  
رڳو ئي انائون رڳو هٿ وڌائي،  
اي مالڪ اسان جا، هي تنهنجي خدا!

## نظم

### سندو ستار پيرزادو

شيشي جي هڪ عورت آهي،  
چوڏهين جو هڪ چنڊ پي آهي،  
ڪائي جهڙا ساوا پنڇي،  
شيشي جي ئي وڻ تي ويهي،  
رات اکين ۾ ويڙهن وينا،  
شيشي ۾ جو عڪس لڪيل آ،  
روز نئون پتر اڇلائي،  
خود کي چڪناچور ڪري ٿو.  
شيشي ۾ هڪ شام ٺهيل آ،  
جنهن ۾ هڪڙو خوف لڪيل آ،  
ٿوري ٿوري اوندهه آهي،  
ويراني ۾ هڪڙو پاڇو،  
اڌ انديري ۾ گم ٿي ٿو،  
شيشي جي مُهرن تي ڪي ئي،  
ڪائي جا ئي لفظ لڪيل هن،  
جن مان سڀ قديمي ٻوليون،  
ليئا پائي گم ٿين ٿيون.  
ڪائي جا هن گل سمورا،  
ڪائي جو ئي جهنگل آهي،

جنهن ۾ ڪي ئي ناگ رهن ٿا،  
اڪيون جن جون ڪائي جهڙيون  
جن ۾ ڪوئي راز لڪيل آ،  
جهنگل ۾ هڪ رستو آهي،  
جنهن جي ڪا به ته منزل ناهي،  
نيري رستي تي ئي هاريل،  
ڪائي جا ڪي ڳوڙها آهن.  
دنيا مونکي فينئسي جو،  
بند پيل ڪو درُ لڳي ٿي،  
دنيا مون کي شيشي جو ٿي،  
هڪ عجائب گهر لڳي ٿي.

•  
\*\*

## نظر

### عريشا بخاري

موسمن جو مينهن چوڌاري وٺو  
تو ڏٺو هو نينهن چوڌاري وٺو  
هر ڪنهن کي ياد آيا دلربا  
هر ڪنهن جو روح ٿي ويو بيقرار  
سڪ جي ڪا چڪ تو تائين پڳي؟  
يا پسان ٿي برهه بر آئون رڳي؟  
دل به هڪڙي، مان به هڪل ۽ اداس  
ڪاش ڪو نياپو پڄي تو وٽ پوي  
نينهن ٿي پئي نئون نرالو تون اچي وڃ  
ڪونج جهڙي پيار کي آت ملي  
تون اچي وڃ...

..



نظر

ڊاڪٽر آمند سومرو

منت

موسمن جون ميارون  
تو به ڇا ٻڌيون آهن  
پا  
اهي  
اڪيلي ئي  
مونکي پيون ستائن ٿيون  
دل پيون رنجائن ٿيون  
هڪ دفعو ئي مل سائين  
موسمن جون منتون مڃ...

\*\*

نظر

ڊاڪٽر ثمينہ واحد

اسين بس مٽي جا ماڻهون آهيون

وراثت ۾ مليل هر درد کان  
اسان جو روح باغي آ..

اسان ڇا ڄاڻئون مسلماني!  
اسين بس مٽي جا ماڻهون؛

ڪٿي ملا آهيون مسجد ۾ ...  
ڪٿي مجلس ۾ مانامي؛

اسان پنهنجي وصفن کان سدائين بيخبر آهيون!  
اسان جي ذات آ ڪنهن لاءِ!  
اسان جي ذات آ ڪنهن لاءِ  
ڏيون ڪا دانهن ڪهڙي در!  
آهيون هر پل يزدن سان

پر ٻڌ!

اسين حقيقت آشنا آهيون  
اڪيلا ٿي ...

رڪڻون ٿا بار اڪين تي  
اسين تنهنجن ۾ نه پنهنجن ۾  
اسين بس لوڪ اهڙائي  
جنهن جو روح باغي آ

..

## نثري نظر

### سپت پيرزادو

#### خواب

اکين جي باغ ۾  
نوان خواب پوکيو  
انهن کي ساڀيان جو پاڻي ڏيو  
پڪ ڄاڻو ته  
پڻ چڻ جي مند ۾  
جڏهن خواب  
خشڪ اکڙين مان  
چڻ لڳندا آهن  
۽ انهن جي ساڀيان جي  
کا اميد  
باقي نه رهندي آهي  
زندگي  
پنهنجو جوهر  
۽  
سونهن  
وڃائي ويهندي آهي

..

نظر

الفت حسين

شاھ لطيف يونيورسٽيءَ جي ياد ۾

ڏينهن آهي آخري هن شهر ۾  
ڳوٺ ڏي پنهنجي وڃان تي ماءُ ڏي  
ماءُ منهنجي آ عظيم  
جنهن قبيلي جون سڀئي ريتون لتاڙي  
علم جون ڪوليون دريون  
روشنيءَ جي راه ڏيڪاري اسان کي  
مان ورسٽيءَ ۾ اچي  
پوليٽيڪل سائنس جا  
سڀ نظريا ۽ دليل  
هئا پڙهيا  
هيئن سان هنڊايا  
پر ڪڏهن سياست نه ڪئي  
زندگيءَ ۾  
شاعريءَ ۾  
دوستيءَ ۾  
ڪيترا استاد ها جي مهربان  
ڏاڍا ٻاجهه شفيق  
پر ڪي وڏا استاد پي ها  
هاڻل جون هي ڀتيون  
اڄ اوڀريون چوٽيون لڳيون-

شاعرن کي ڇا چئون  
 هو لکن ميسيج ۾ ٿا  
 آءِ لو يو جان جانان  
 مان رهان خاموش ٿي  
 هو ٿا سمجهن  
 پيار ٿي ويو  
 آهي ڇڻ اقرار ٿي ويو  
 جي پڇان ٿي خير آهي؟  
 هي اوهان ڇا ٿا لکو؟  
 هو چون ٿا  
 فن اسان جو افق جي سرحد ٽپي ٿو  
 تو جهڙيون سو چوڪريون  
 ٿيون ڦرن پيون آسپاس  
 اهڙيون سو ڳالهيون، قصا  
 ڪاوڙ، ڪروڙ  
 سڀ اچن ٿيون ياد اچ  
 ميس جي ماني مهانگي ٿي هئي  
 ڪنهن نه پر ڪنهن کان پڇيو  
 پاڻ کي رزاق هو هئا سمجهڻ لڳا  
 ڪيترا ڇمچا انهن جا  
 ڪيتري ڪڙ ڪڙ هئي-  
 عورتن جي حقن جا اڳواڻ هي  
 عورتن جي دل جون ڳالهيون  
 جي نٿا سمجهي سگهن  
 ڪيتري تفرير تن جي لاجواب  
 لفظ سهڻا، استعارا ۽ دليل  
 هاسٽل جون شوخ چنچل ساهڙيون  
 ڪيئن وساري ٿي سگهان؟



بس هٺان ٿي ڳوٺ پنهنجي  
لاٽيريءَ ۾ رڪيل شاھ جي رسالي کي  
آخري ڄمي  
هاستل جي مٿن دروازي کي  
آخري ڄمي  
هاستل جي در تي بيٺل  
ڄڻ ته پهريدار وٺ کي  
آخري ڄمي  
هڪڙي ڄمي هن جي لاءِ  
انويٽ ۾ بند ڪري  
هن ڏانهن امائي  
مان ڪريان ٿي الوداع!  
اي ورسٽي الوداع!!

..

برسات

رات اويلي ويلى اندر  
 ڪارن ڪارن ڪڪرن مان  
 مينهن ٿميو پئي  
 ڄڻ ته اکين مان نينهن ٿميو پئي  
 جهور ڪراڙا نيڻ ڀلا  
 آڏيءَ ڌاري  
 ڪنهن لاءِ ترسيا  
 ڪنهن لاءِ تڙپيا  
 اپ تڪي ٿو سوچن ۾  
 ڪنهن لاءِ سارو ديس ڀري ٿو  
 دانهن ڪري ٿو  
 واري واري سڀڪنهن من ۾  
 تيز هوا جا جهوٽا آهن  
 پن ڪرڻ ٿا اڳر تي  
 بي وس سڀ ئي ٻوٽا آهن  
 ٻاهر ڪيڏي چاندوڪي آ  
 اندر ڪيڏي اوندھ آهي  
 ڇا لاءِ وسامي باھ اجهائي ناهي  
 هن جو سار اماڻي ناهي  
 ڪيڏي جهڪ لڳي ٿي پئي  
 وڪريل سڀ اکيرا آهن  
 اجڙيل سارا ديرا آهن

••

## شبیر کوکر

### شیشی جی دیوار

ڄاتل سڃاتل  
اجنبی ماڻهو جی وچ ۾  
زندگي پلجي وئي!  
ڪنهن اجنبی شهر ۾  
نظر نظر سان نه ملي  
جواني تنها رهجي وئي!  
پٿر جي دنيا ۾  
پٿر سان پٿر ئي اٽڪيو  
ڪنهن کي ڪا خبر نه پئي  
ڪنهن جي دل ٽٽي پئي  
نگاهون ته هڪٻئي کي تڪينديون رهيون  
ڪو اظهار نه ٿي اظهار رهجي ويو پر  
اقرار انڪار رهجي ويو پر  
ڄاتل سڃاتل  
اجنبی ماڻهن جي وچ ۾.

\*\*

نظر

راحت نياز ڀتو

دعا آهي ...

دعا آهي سدا لڙن  
لڳل ميندي هجي هٿڙن  
نه ڪنهنجي سيند ميري ٿئي  
نه دامن داغ ڪو وڪري  
ملي ٻانهن جي سيراندي  
لبن تي گيت ڌرتي جو  
هجي سائو سدائين ٿر  
وسي برسات ڪاڇي تي  
ٻڌن ڳانا ڪرائي ڀر  
هجي خوشحال هي ڌرتي

خوشين جي جهول تون مائين  
غمڻ کان ڏور ٿي پاڇو  
قلم منزل سدا مائين  
رهي قائم سدا محبت  
ازل کان واسطو توسان  
وڻن جي ڪنڊ پاسي ۾  
لکيا سين نانءُ هڪ ٻئي جا  
اڃان تائين سي جهونا وڻ  
رهن قائم قيامت تڪ  
وڇوڙي جو پکي ڪوئي  
نه ويهي لامر آلي تي  
ڪلن سڀ ڪيت ۾ هاري  
هجي آزاد هر ناري  
وڙهن مارو نه پاڻي تي  
نه ٿي مظلوم ڪا ڪاري  
وطن جي آجپي خاطر  
مفادن کان گهڻو اڳتي  
لڄون تڙپون جياپي لڻ  
خدا پوءِ ڏينهن سو آڻي  
ملن محبوب سڀني سان  
هجي اظهار آزادي  
دعا آهي سدا لبرن ...

\*\*



## بختاور منصور

آ چنڊ ڪيون آڪيرو  
آءُ پڪين جيئن پار هلون ۽  
ناهيون ڪوئي ديرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو.

اڏري ڪو آڪاس ۾ هلجي،  
پل پو هڪڙو پيرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو،

اهڙو ڪوئي ديس وسايون،  
ملي نه ڪنهن کي پيرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو،

ڪيڏي ڪيڏي ڪيرا ٿي پئون،  
بالڪ جيئن ڪو ميرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو،

جرڪي پئون چانڊاڻ ۾ چمڪي،  
چانڊوڪي ٿي گهيرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو،

هارائڻ ۽ ڪٽڻ هڪ جهڙو،  
هجي نه ڪوئي سيرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو.

”بخت“ هتي هر هر پيو آڻي،  
هينئڙو ٿي پيو هيرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو،  
آ چنڊ ڪيون آڪيرو.

\*\*

وائي

صاحب خان ميمڻ

ماروڻڙا ٿيا ملير  
آئون ته بند يائي بند ۾

بادل برسيا ماروڻڙن تي  
ٿيڙم ساه سڌير  
آئون ته قيديائي بند ۾

واءِ وٺيجو واه جو وريو  
هينئڙي لڳي ٿر هير  
آئون ته بنديائي قابو بند ۾

خواب ۾ پنهنجي مارن مليس  
ڪنڊون ورهائيون ڪير  
آئون ته بنديائي قابو بند ۾

صاحب چوي ٿو سانگيڙن سان  
هاڃان ڪر نه همير  
آئون ته بنديائي قابو بند ۾  
..

وائي

ضميرگولو

چنريء ڏند چين ۾  
مني مرڪي پئي

مينديء جو لاتي اتائين  
ڪيئي چٽ هٿن ۾  
مني مرڪي پئي

چنڊ ستارن ماڻڪيون  
اپ جي نيٽن ۾  
مني مرڪي پئي

ناهي چوٽو چاه مان  
موتيو وارن ۾  
مني مرڪي پئي  
\*\*

## نظر

### عظيم سندي

مان انسان انسان انسان آهيان،  
مان هندو يا مومن مسلمان ناهيان.  
مان انسان انسان انسان آهيان.  
هي سسئي هي سهڻي هي مارئي ڇا آهي؟  
هي شاه سچ جي ويو راه ناهي،  
هي پيار محبت نه آهي ته ڇا آهي؟  
تو ان رساليڪي ايمان پائين.  
مان انسان انسان انسان آهيان.

..

## نظر

### کيمچند شرما

هن “  
گيت جي نرڙ تي  
ته “  
نالو تنهنجو اڪريل آهي !  
پر  
گيت جا سڃا مهاندا “  
سپاءِ  
۽  
سیرت  
تنهنجي ذات جي نسل سان نٿا لڳن !  
شايد !  
تنهنجو مغرور  
نالو  
اوپري سوچ ۽ سڀيتا جي ديوي سان  
علم جي الوٽ نشي ۾  
سمهي رهيو آهي !!

\*\*



واڻي

خالدہ منیر

ڪيڏيون ڪرڻيون هيون ڪي  
ڳالهيون ڳهلي يار جون!!

هاڻ نه ملنداسين پرين!  
رهجي ويون ڙي!  
ڳالهيون ڳهلي يار جون!!

من ٿي من ۾ ڪائينديون  
هن سين نه ڪيون جي  
ڳالهيون ڳهلي يار جون!!

جنهن ڪي ساري سرتيون  
من ۾ مينهن وسي  
ڳالهيون ڳهلي يار جون!!

واپس جي وري پون  
اکڙين عيد ٿئي  
ڳالهيون ڳهلي يار جون!!

## نثري نظر

### حميده گل

مون داخليت جي جهان ۾  
جهاتي پائي  
خارجيت جي آربي ڏني  
مشاهدي مسندي وينل ذهن ۽  
فلسفہ زندگي جا سڀ اصول  
پرک جي رڻ ۾ رلندي ڏنامون  
درد جا ڪيئي جهان  
شمشان ۾ رک ٿيندي ڏنا مون  
ازل جو پنڌ ڪٿي ڇو نٿو --!؟  
روح جو وڇڙيل حصو به  
پولار جي گردش ۾ گم آهي اڃا،  
سورج جو تڪو تاءُ  
باک جي پيشاني تي چمي جو  
دڪندڙ ڏنڀ ڇڏي  
ڪائنات کي پنهنجي هستي جي  
مڌڪائڻ لاءِ وڃي چڪو آهي  
رات جي زنجير  
ڇڻ ڇڻ جي اعلان سان  
پالا اڀا ڪيو شام جي چني ۾

لڪل باڪ جي پيرن کي  
قفس ڪرڻ جا سانباها ڪري رهي آهي  
مون چرڪي داخليت جي جهان ۾  
منهن لڪائي پناه جي صدا بلند ڪئي  
پر خارجيت جي مشاهداتي آرسي  
منهنجي چوڌاري شمشان جا شعلا  
بلند ڪري چڪي آهي  
رات جي زنجير هٿان  
باڪ قفس ٿي چڪي آهي  
۽ ازل جو پنڌ  
ڪائنات جي گردش جي گوشن جي  
ور وڪڙن ۾ پڪڙجي  
گم ٿي چڪو آهي  
..

وائي

فقير محمد سندي

پنهنجي پياري کان،  
قربن واري کان.  
وچڙيل آهيان مان.

ريتن رسمن کان،  
هل هنگامن کان.  
وچڙيل آهيان مان.

قربن واري کان.  
شهر ڳوٺن کان،  
واهڻ رستن کان.

وچڙيل آهيان مان.  
قربن واري کان.  
پنهنجي زخمن کان،  
ڏانهن دردن کان.

وچڙيل آهيان مان.  
قربن واري کان.

\*\*

## نثري نظر

حسن مجتبيٰ

### مونڪي پاڻ ۾ دفنائيندينءَ !

هن جون چوڙيون ٽٽن ٿيون،  
۽ دل جي ڌڪ ڌڪ بند ٿي ٿئي.  
رات جي تنهائيءَ ۾ پڇندي آ  
تو اڄ مسڪرايو هيو،  
۽ ڪنڌ ڏوڙي چوندو هان 'نه'  
تنهنجي چپ چپ ته ترسايو آ.  
تون پنهنجي ضمير کان پڇ  
تو مونڪي ڪيترو سانڍيو آ.  
دل جي ڌڙڪن بند ڪري  
۽ ساهه مٽ ۾ رکي  
جڏهي مان جيئندس  
تڏهي تون مونڪي  
پنهنجو پاڻ ۾ دفنائيندينءَ !؟



## سرائيکي کافي

عبدالستار رستمائي

نهن درد ويندا، نهن يار رلدا،  
پرین دي پښ لښي، پيا دل هي ڳلدا،

نه واټون وليا هي، نه خطڙا مليا هي،  
وره ول لڳيا هي، نه وارث هويا هي،  
بن دیدار دلبر، پيا من هي مردا،  
نهن درد ويندا، نهن يار رلدا،

اپ کنون اوچتا، ککر کيتا کڙکا،  
اٿون دا اوھيرا، اٿون برھ پڙکا،  
مني نا ملڻ دي، نهن هانو ٺردا،

جدائي جاني دي هي، جان هڻ جلائي،  
موت کنون اڳي ئي هڻي موت آئي،  
ڏکين ڏيل ڏاڍا، ول ول پيا ڏردا،  
ناهي درد ويندا، ناهي يار رلدا،

”ستار“ سرير ميڏا، نهن تار تردا،  
دريا دي اندر، لهرين پيا لڙهدا،  
حالين انهن دي نهن پيار مڙدا،  
نهن درد ويندا، ناهين يار رلدا.

\*\*

## شبیر نازش

ہن نہیں اوہو بھٹکھاں ہتھوں تنگ شکاری نسل،  
مٹی ورگے جال میں ہن تے چوگا وی نہیں اصلی۔

جر لیندے ساں وڈے وڈے پھٹ جوانی وارے،  
کھ مروڑ کے دل نہ توڑیں، ہن نہیں سی۔ ی پلسی۔

جے نہیں پگدی ایتھوں ای مڑ جا، ایتھے ای کھچ دے لیکا،  
میں نہیں فردا لے کے اپنے نال بیڑے فصلی۔

بھانویں درد ہنیری کدے، ویلا دھوڑ اڈا دے،  
تیریاں راہواں اُتے لگی اکھ کدے نہیں ملسی۔

بیبا میریاں پھل بھر سدھراں، ویکھ نہ اینج اچھال،  
ہاسے ہاسے دے وچ کدھرے پے نہ جاوے ہلسی۔

\*\*

## پنجابی غزل

ساتھوں جسڑا ہویا جرم وفاقاں دا،  
لکھ کرو ہن سجنو حکم سزاواں دا۔

دھرتی ماں دے اوہی بن گے رکھوالے،  
جنناں نہیں ددھ پیتا اپنیاں ماواں دا۔

قسمت ای جد اپنی ماڑی ہووے تے،  
چاہ نہیں ملدا اپنے بھین بھراواں دا۔

بچیاں وانگوں ہتھ اچ پتھر چک چک کے،  
بچھا کرنا چھڈ دے ہُن توں کاواں دا۔

ہو گئی میتھوں کوئی خطاتے معاف کرو،  
ایہ بند اے پتلا یار خطاواں دا۔

آئے نیں مہمان سلکھنے ویکھ امین،  
جا ہوٹل تے آؤر دے آ چاواں دا۔

☆☆

ہند کو غزل

افضل ہزاروی

کے غلطی میں کیتی اے،  
عشق نماز جو نیتی اے۔

دل بچ تے بد نیتی اے،  
رہندا بچ مسیتی اے۔

کے دساں میں کینجو دل دی،  
اڈڑی چادر سیتی اے۔

باہروں چم چم مکھڑے نے،  
اندر یار پلیتی اے۔

اج تک ہوش نہ آیا فر،  
اکھیاں نال جو پیتی ہے۔

افضل سارے نادم نے،  
کسی گل توں کیتی اے۔

☆☆

### پنجابی

جیویں گدڑی مٹی نال فقیراں دی۔

تیرے ہتھ اچ بھل مرے ہتھ بس مٹی،  
بیبا ہوندی ساری کھیڈ لکیراں دی۔

رانجھے آ کے خواب چ واپس مزدے نیں،  
نیندر اڈدی جاندی سونیاں ہیراں دی۔

بھائی صرف سہارا تے نیں ما پیاں دا،  
اوہ ہوندے نیں شان وی سب ہمیشراں دی۔

لفظاں دا کھلیار بُرا ان پڑھ اگے،  
کتیاں نوں تے قدر نیں ہوندی کھیراں دی۔

☆☆





اڪادمي ادبيات، سنڌ، پاڪستان  
لياقت سيموريل لائبريري بلڊنگ اسٽيڊيم روڊ ڪراچي

